

ہندوستان کے عہد ماضی میں  
مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

جلد دوم

سید صباح الدین عبدالرحمن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس  
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

DATA ENTERED

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں

کی

مذہبی رواداری

27117

جلد دوم

سید صباح الدین عبدالرحمن

www.KitaboSunnat.com

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ۔ یو پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

© جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۱۴۹

نام کتاب :	ہندوستان کی عہد ماضی میں مسلمانوں کی مذہبی رواداری جلد دوم
نام مصنف :	سید صباح الدین عبدالرحمن
صفحات :	۱۹۷
طباعت :	جدید معیاری ایڈیشن ۲۰۰۹ء
مطبع :	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر :	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
قیمت :	۰۰۷ روپے

ISBN 978-93-80104-37-9

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.BOX NO:19

SHIBLI ROAD, AZAMGARH 276001 (U.P.)

E-Mail: Shibli-Academy @ Rediff Mail. Com

Website: WWW.Shibli Academy.org

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

27117

۲

## فہرست مضامین

## ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمانوں کی مذہبی رواداری

## جلد دوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷	لشکریوں کے ساتھ رواداری	۱	دیباچہ از۔ مرتب
۲۸	ٹوڈرل کے ساتھ شاہانہ عنایت	۶	ظہیر الدین
//	راجہ بیر بر کی موت پر غم	۱۰	ہمایوں
۳۰	ایک ہندی شاعر کے ساتھ	۱۴	شیر شاہ
	عفو و درگزر	۱۸	علمی رواداری
//	راجپوتوں کے عہدے دینے	۱۹	اسلام شاہ
	میں فیاضی	۲۲-۱۰۶	اکبر
۳۵	سنسکرت علوم کی ترویج	۲۲	اکبر کی رواداری
۳۷	ہندی شاعری کی سرپرستی	۲۳	محبت و مودت
۴۰	ہندی شاعری کا زریں دور	۲۴	راجپوتوں کی دل جوئی
۴۲	ہندی کے مسلمان شعرا	۲۵	راجپوتوں کی مثالی شجاعت
۴۳	فنون لطیفہ میں رواداری	۲۶	راجپوتوں کی مثالی وفاداری
۴۴	مصوری میں رواداری	//	راجپوتوں پر اعتماد کلی
۴۵	دین الہی	//	مذہبی لگاؤ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۱	اوداجی رام	۴۶	دین الہی اور ملا بدایونی
//	راجہ باسو	۶۲	ابوالفضل اور دین الہی
۱۳۲	راے بہاری داس بخشی	۶۳	اکبر نامہ اور دین الہی
//	راے بنوالی داس	۹۹	ابوالفضل کی عام رواداری
//	راؤ سو پھورتیہ	۱۰۶	اکبر اور رانا پرتاب
//	راجہ چیمار سنگھ بندیلہ	۱۰۸-۱۱۰	جہانگیر
//	راجہ بھرت بندیلہ	۱۱۰	جہانگیر اور مولانا نور اللہ شوستری
//	راجہ جگت سنگھ	۱۱۱	جہانگیر اور گروارجن
۱۳۳	راجہ بھاؤ سنگھ	۱۱۲	جہانگیر اور گرو مان سنگھ
//	راجہ جگت سنگھ	۱۱۳	جہانگیر اور شیخ ابراہیم بابا
//	رام چندر بندیلہ	//	جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانی
//	راجہ کلیان جہلمیری	۱۲۰	مذہبی پیشواؤں سے جہانگیر کی عقیدت
	سر بلند راے رام راج	۱۲۳	ہندو پنڈتوں کی صحبت
۱۳۴	راؤ تن باڈا	۱۲۴	جہانگیری محل میں مندر کی تعمیر
//	روپ چند گوالیاری	//	راجپوت سرداروں سے جہانگیر کی محبت
//	راجہ سورج سنگھ راٹھور	۱۲۷	میواڑ میں جنگ کی نوعیت
۱۳۵	وائے راے سنگھ راٹھور	۱۲۹	جہانگیر کے دربار کے راجپوت امرا
//	راے رایان پتر داس بکرماجیت	//	راجہ مان سنگھ
	راے سورج سنگھ المعروف	۱۳۰	راجہ سنگھ دیو بندیلہ
۱۳۶	بہ راؤ بھورتیہ	۱۳۱	راجہ انوپ بڑ گوجر
//	عمدۃ الملک راے رایان	//	انی راے سنگھ دن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۸	جہانگیر کی مذہبی فراخ دلی کا اعتراف	۱۳۷	راجہ سارنگ دیو
۱۵۲-۱۹۳	شاہ جہاں	//	راجہ سنگرام
۱۵۳	رائے رایان دیانت رائے گجراتی	//	ستر سال کچھواہہ
	رائے رایان راجہ گھنا تھ داس	//	راجہ شیام سنگھ
۱۵۴	سعد اللہ خانی	//	رانا سکرا
//	مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور	//	راجہ کشن داس
۱۵۵	راجہ جے سنگھ	//	کشن سنگھ راٹھور
//	راجہ جگت سنگھ	۱۳۸	راجہ کلیان
//	راجہ بٹھل داس گوڑ	//	کیشو داس ماواراٹھور
//	راجہ گج سنگھ	//	رانا کرن
۱۵۶	بالو جی دکھنی	//	رائے گوردھن سورج دھج
//	راؤ امر سنگھ	۱۳۹	راجہ گوردھر کچھواہہ
//	راجہ رائے سنگھ	//	برائے مانی داس
//	ہمران دکھنی	//	راجہ مان سنگھ
//	راجہ روپ سنگھ راٹھور	۱۴۰	راجہ گج سنگھ
//	راجہ امر سنگھ راٹھور	//	سنیاسیوں سے جہانگیر کی عقیدت
//	ستر سال ہاڈا		سنیاسی جد روپ اسرم
//	کمندر سنگھ ہاڈا	۱۴۳	راجپوت بیویوں سے جہانگیر کی قلبی محبت
//	مہیش داس راٹھو مہابت خانی	۱۴۵	ہندو علم و ادب سے جہانگیر کی دلچسپی
۱۵۷	مادت رائے دکنی	//	جہانگیری دور میں ہندوؤں کے
//	اوداجی رام دکنی	//	علوم سے مسلمانوں کی دلچسپی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۹	راے سنگھ جھالا	۱۵۷	راجہ انرودھ گوڑ
//	راوروپ سنگھ چندراوت	//	بھرجی
//	رتن سنگھ راٹھور	//	راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ
۱۶۰	راجہ رام روپ	//	مادھو سنگھ ہاڈا
//	راجہ امر سنگھ زوری	//	راجہ جگت سنگھ
//	راجہ بدن سنگھ بہددریہ	۱۵۸	راجہ منکو جی پنا لکرونی
//	بہارا مل	//	راے کاسنی داس
//	راؤ امر سنگھ چندراوت	//	ہری سنگھ راٹھور
//	بکرماجیت جگ راج بندیلہ	//	باناجی دیوریا
//	بلبھدر شخاوت	//	گوپال سنگھ
۱۶۱	بہاری داس کچھواہہ	//	گوکل داس سیسودیہ
//	راجہ بھیم راٹھور	۱۵۸	گوردھن راٹھور
//	راے بہاری مل دیوان	//	راے مکنداس ہارنولی
//	پرتھی راج راٹھور	//	بگرام کچھواہہ
//	راجہ پرتھی چند	//	چندر جن بندیلہ
//	راے تلوک چند کچھواہہ	۱۵۹	راجہ دیپی سنگھ بندیلہ
//	برسوجی بھونسلا	//	راؤ دوو سیسودیہ
//	روال پونچا	//	راجہ دھارکا داس کچھواہہ
//	پرتاب چردہ	//	راوتھ دیال داس جھالا
//	راجہ ٹوڈر مال شاہ جہانی	//	رام داس زوری
۱۶۲	جادون راے دکنی	//	راے سنگھ



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۴	شاہ جہاں پر الزامات	۱۶۲	راجہ جے رام بڑ گوجر
۱۶۷	سنسکرت اور ہندی کی سرپرستی	//	راج سنگھ
	ہندی راگینوں سے دلچسپی	//	کنور رام سنگھ
۱۶۸	ہندوؤں کے علوم سے مسلمانوں	//	راج سنگھ راٹھور یہا دن
	کی دلچسپی	//	رام سنگھ راٹھور
//	ہندوؤں کے مذہبی علوم سے	//	راؤ پتی سنگھ چندراوت
	داراشکوہ کی دلچسپی	//	راے با
۱۶۹	عناصر	//	رادت راے دکنی
۱۷۰	حواس	//	راجہ سیورام گوڑ
//	شغل	۱۶۳	سبحان سنگھ سیسودیہ
//	صفات اللہ تعالیٰ	//	بیل سنگھ سیسودیہ
//	روح	//	سیام سنگھ
۱۷۱	عوالم اربعہ	//	راول سری
//	آواز	//	راؤ کر بہورتیہ
//	نور	//	کشن سنگھ بھدرودیہ
//	رویت	//	گردھرداس گوڑ
//	اسمائے الہی وغیرہ	//	اندرسال ہاڈا
//	برہماند	//	ہفت صدی کے منصب دار
//	جہات	۱۶۴	شش صدی کے منصب دار
۱۷۲	آسمان	//	پانصدی کے منصب دار
//	زمین	//	شاہ جہاں کی روادارانہ حکمت عملی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۹	لغت	۱۷۲	قسمت زمین
//	ترجے	۱۷۳	عالم برزخ
۱۸۹	مذہبی کتابیں	//	قیامت
//	طب	//	مکت
۱۹۰	نجوم و ریاضی	۱۷۹	شاہ جہاں کی حکومت کی نوعیت
//	دیگر علوم	۱۸۰	شاہ جہانی دربار
//	ہندی	//	شہنشاہ کی ذات
۱۹۱	عمارتیں	۱۸۱	دیوان عام
۱۹۳	مصوری	۱۸۲	دیوان خاص
//	خطاطی	۱۸۳	شاہ برج
۱۹۳	موسیقی	//	حرم
//	طرز حکمت	//	شام کے مشاغل
		//	خواب گاہ
		۱۸۴	انصاف کا دربار
		//	ترتیب و نظم
		۱۸۵	جشن
		//	دربار کی عجائبات
		//	کلچر کی ترقی
		//	تعلیم
		۱۸۶	شعرا
		۱۸۷	نثر

۲۷۱۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ویباچہ

ہندوستان کے ماضی کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی یہ دوسری جلد ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، اس کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس کے بعد یہ جلد کافی تاخیر سے شائع ہو رہی ہے، اس لیے کہ اس کی کتابت کے لیے کوئی اچھا کاتب نہیں مل رہا تھا، الحمد للہ کہ اب یہ شائع ہو رہی ہے۔

کتاب کا موضوع بڑا ہی متنازع فیہ ہے لیکن مؤرخ کی نیت صحیح ہو تو موضوع کتنا ہی متنازع فیہ ہو اس کے روشن پہلو دکھانا کچھ مشکل کام نہیں، کون سی حکومت ہے جو بے داغ رہی ہے لیکن اس کے صرف داغ دار پہلوؤں کو پیش کیا جائے تو اس کے اچھے پہلو آسانی سے نظر انداز ہو جاتے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان میں برابر ہندو مسلمان بلوے ہو رہے ہیں، ان سطروں کے لکھتے وقت ہندوستان کے مشہور ہفتہ وار رسالہ سنڈے مورننگ ۳-۹ اپریل ۱۹۸۳ء میں یہ اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں کہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۱ء تک چار ہزار دو سو اڑسٹھ ہندو مسلم بلوے ہوئے اور ۱۹۸۲ء کی تعداد چار سو چوہتر تھی، یعنی اس فساد کا اوسط روزانہ ایک سے زیادہ رہا، اگر کوئی مؤرخ ان بلوؤں کی خون ریزوں اور ہولناکیوں کی تاریخ

لکھ کر اس دور کی تاریخ ختم کر دے تو کیا یہ سمجھا جائے گا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں صرف ہندو مسلم فسادات ہی ہوتے رہے، اسی طرح ۱۹۴۷ء کے بعد بعض ہندو مورخین ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی جو تاریخیں لکھ رہے ہیں، اس میں وہ ایسے جذبات کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ ہندو ہندوستان کے مسلمان فاتحین کی حکومت کو ناپسند کرتے اور چاہتے ہیں کہ ملیچھوں (یعنی مسلمانوں) کو اس دیس سے نکال کر اس ملک کو پھر آریہ ورت بنا دیں (وہی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل ج ۶ ص ۶۱۷) مذکورہ بالا رسالہ سنڈے میں ایک مضمون اس سرخی کے ساتھ شائع ہوا ہے کہ مسلمانوں کو ہندو بنایا جائے اور اس کے مضمون نگار اودیان شنکر نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کی ایک تنظیم وشو ہندو پریشد ہے جس کے صدر اودے پور کے سابق مہارانا ہیں، اس نے ایک پرزور کوشش کا آغاز کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو دھرم میں داخل کیا جائے، (ص ۲۷) ہندوستان کے اندر کچھ ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو یہ تحریک چلانا چاہتی ہیں کہ مسلمان اگر واقعی ملک کے وفادار ہیں تو وہ اپنا اسلامی نام بدل کر ہندوانہ نام رکھیں، عربی پڑھنا چھوڑ دیں، اپنی زبان کے لیے ہندی رسم الخط اختیار کریں، مکہ مدینہ کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ہندوؤں کے تہوار کو قومی تہوار سمجھیں، ہندوؤں کی تیرتھ گاہوں کو قومی تیرتھ گاہیں سمجھیں وغیرہ وغیرہ، ایسی تنظیمیں یہ بھی چاہتی ہیں کہ حکومت میں مسلمانوں کو اونچے عہدے نہ دیے جائیں، تجارتی کاروبار میں ان کو بڑھنے نہ دیا جائے، جہاں ان کی تجارتی اور اقتصادی حالت اچھی ہو وہاں بلوے فساد کر کے ان کو پریشان حال رکھا جائے تو کیا ایسے جذبات کو ہندو مذہب کی تعلیم اور ہندوستان کی موجودہ حکومت کی پالیسی سمجھا جائے گا یا کسی خاص جماعت کی انتہا پسندی پر محمول کیا جائے گا ایسے انتہا پسندوں کو یہ بھی سوچنا ہے کہ اس قسم کے جذبات کا اظہار ازمنہ وسطی کے فاتحوں کے جلو میں رہنے والے بعض مورخین نے کیا تو وہ اس لحاظ سے قابل اعتنا نہیں کہ وہ جمہوریت کا زمانہ نہیں تھا لیکن آج کل کے جمہوری اور بین الاقوامی

دور اور انسانی حقوق کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ انتہا پسندی کسی ملک کے معاشرہ اور سیاست کے لیے مفید ہے یا مضر، ہمارے وطن کو قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہے، اس کے نشوونما کے لیے ہمارا ذہن کیسا ہونا چاہیے، تاریخی لٹریچر کو ہمارے ذہنی، نفسیاتی، سیاسی، معاشرتی بلکہ مذہبی شعور بنانے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ایسا مواد جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں معروضیت کے ساتھ تاریخی حقیقت بھی ہو، مغلوں نے یہاں آکر اپنے پاؤں جمانے کی خاطر قدم قدم پر اپنا خون بہایا اور یہاں کے لوگوں کا بھی خون بہا لیکن جب وہ یہاں جم گئے تو پھر اس کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے کہ انھوں نے علاقوں کی تسخیر کے بعد یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کن کن طریقوں سے کی، اس کتاب سے یہ اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ہندوستان کو جنت نشان بنانے کی خاطر یہاں کے لوگوں کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، انھوں نے ایک اچھی حکومت قائم کرنے کی خاطر یہاں کے لوگوں سے ہر طرح کا میل جول بڑھایا ان کے رسم و رواج میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، ان کے پرسنل لا کو برقرار رکھا، ان کی معاشرتی زندگی میں کوئی خلل نہیں ڈالا، ملک کے نظم و نسق میں ان کو اپنا شریک کار بنایا۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیے، مسلمانوں نے اگر کہیں شورش یا بغاوت کی تو ان کے کچلنے کے لیے ہندو فوجی سرداروں اور منصب داروں کو بھیجنے میں تامل نہیں کیا، شادی بیاہ کے ذریعہ سے رشتے بھی قائم کیے اور ان کے دلوں کی تسخیر کے لیے اکبر نے تو اپنا آبائی مذہب بھی چھوڑ دیا، پھر ہندوؤں کے مذہبی علوم میں سے دید، مہا بھارت، راماین اور اپنشد وغیرہ سے پوری دل چسپی لی، ہندو مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں اشتراک پیدا کرنے کی بھی کوشش کی، ان کے روایتی قصے کہانیوں کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور آگے چل کر تو اپنی مذہبی زبان عربی

اور سرکاری زبان فارسی کو چھوڑ کر ایک ایسی زبان اختیار کر لی جس کو ہندو مسلمان دونوں بولنے لگے، یہ تو آسانی سے دکھایا جاسکتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے بڑی بڑی لڑائیاں لڑ کر خون ریزی اور غارت گری کی لیکن کیا یہ دکھانا مشکل ہے کہ یہاں رہ کر مسلمانوں نے ہندوؤں سے کس کس طرح میل جول بڑھایا، یہاں کے تمدن کو کس کس طرح سنوارا اور یہاں کے ذہنی اور مذہبی خیالات میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں، ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب میں بڑی رنگارنگی ہے اور یہی اس کی اصلی خوبی ہے، اگر کوئی یہ ثابت کرنا چاہے کہ ہندوستانی تمدن کے معنی ہندوؤں کا تمدن ہے تو ہندوستان کی تاریخ کے ساتھ خیانت ہے، ماضی میں جو کچھ ہوا اس پر اگر اس لیے دکھ کا اظہار کیا جائے کہ ہماری اور آپ کی ذاتی خواہشوں کے مطابق نہیں ہوا تو یہ تاریخی فیصلہ سے لا حاصل بغاوت کے مترادف ہے، تاریخ کا فیصلہ بعض اوقات اٹل ہی نہیں بلکہ ظالمانہ ہوتا ہے جس کے سامنے جھکنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہاں تاریخ کے ناگوار فیصلوں کے ساتھ کچھ ایسے بھی فیصلے ہوا کرتے ہیں جن سے حال اور مستقبل کو سنوارا جاسکتا ہے، وطن کی خدمت اسی میں ہے کہ اس کے ماضی کے روشن، خوشگوار اور تعمیری پہلوؤں کو سامنے لا کر وطن کے لوگوں کے صحت مندانہ رجحانات کی نشوونما کی جائے، زیر نظر کتاب میں یہی کوشش کی گئی ہے، اگر ان اوراق کے مطالعہ کے وقت کوئی یہ سمجھے کہ اس کے حقیر مصنف نے اس میں معروضیت کے بجائے مدافعت اور اعتذار سے کام لیا ہے تو اس کی رائے کو غلط سمجھنے میں کسی کو حق نہیں، مگر اس رائے کے اظہار کرنے میں بھی کسی کو کوئی روک نہیں سکتا کہ اگر زنگیست ذہن پر چھائی ہو تو پھر کوئی بہتر سے بہتر چیز میں بھی کوئی نہ کوئی خرابی ضرور نظر آئے گی۔

ہر قسم کی احتیاط کے باوجود ممکن ہے، اس کتاب میں کتابت و طباعت کی کچھ

جلد دوم

۵

مذہبی رواداری

غلطیاں رہ گئی ہوں اور ہندی کے اشعار لکھنے میں املا کی غلطیاں ہو گئی ہوں، ایسی اور دوسری  
چھوٹی غلطیاں ناظرین اپنے ذوق سلیم سے درست کر لیں۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۲ اپریل ۱۹۸۳ء

ہمچندان:

سید صباح الدین عبدالرحمان



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ظہیر الدین بابر

مغلوں کا دورِ حکومت شروع ہوا تو سیاسی اور مذہبی رواداری کا ایک نیا باب کھل گیا، بابر فاتح بن کر ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا تھا لیکن اس پر مذہبی تعصب کا الزام نہیں رکھا جاسکتا ہے، بلکہ وہ اپنے پیچھے فراخ دلی، رحم دلی، ہمدردی، فیاضی، رواداری، صاف باطنی کی ایک خوشگوار یاد چھوڑ گیا ہے، جس کے معترف نہ صرف مسلمان بلکہ موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی ہیں، اس کے حسبِ ذیل وصایا کا حوالہ اب تاریخوں میں برابر آتا ہے جو اس نے اپنے شہزادے ہمایوں کو دیے:

”اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوحِ دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر سکو گے پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویجِ ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی



ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلافات کو نظر انداز کرتے رہو ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والے رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملنے دو جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، تزک تیموری کا برابر مطالعہ کرتے رہو تاکہ سلطنت کے نظم و نسق کا تجربہ حاصل ہو۔“

(جمادی الاول ۱۹۳۵ء)

یہ نصیحت آمیز تحریر بابر کی تزک میں نہیں ہے، غالباً سابق ریاست بھوپال کے کتب خانہ میں تھی، وہاں سے شائع ہوئی تو مختلف تاریخوں اور کتابوں مثلاً ڈاکٹر راجندر پرشاد کی India Divided پر پروفیسر سری رام کی مغل امپائر ان انڈیا، جرنل آف دی یو۔ پی۔ ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۳۶ء حتیٰ کہ پاکستان کے مصنف شیخ محمد اکرام کی ’رود کوثر‘ میں نقل کی گئی مگر بعض ارباب نظر کی رائے ہے کہ یہ تحریر فرضی ہے جو بابر سے منسوب کر دی گئی کیوں کہ ایسی اہم تحریر اس کی تزک میں ضرور ہوتی لیکن اگر اس نے نہیں لکھی تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں جو رواداری، فراخ دلی اور رحم دلی تھی، اس بنا پر اس کا یہ نصیحت کرنا کوئی تعجب انگیز بھی نہیں، ایک روشن خیال اور بیدار مغز حکمران کو ایسی ہی تحریر لکھنی چاہیے تھی، ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں کو گائے کی قربانی کے سلسلہ کی نصیحت کچھ کھٹکے، مگر دلوں کی تسخیر کی خاطر مسلمان خود گائے کی قربانی چھوڑ دیں تو اس سے کوئی مذہبی قباحت پیدا نہیں ہوتی، ہاں اگر مسلمانوں کے دلوں کو دکھ پہنچانے کی خاطر ان سے یہ حق چھینا جائے تو یہ ضرور دینی اور ذاتی حق شکنی ہوگی۔

بابر نے رانا سانگا کے خلاف خوں ریز جنگ کی مگر اس کے خاندان والوں کے ساتھ بڑی رواداری سے پیش آیا، اس کا خود بیان ہے:

”سہ شنبہ، چودھویں تاریخ رانا سانگا کے دوسرے بیٹے بکرماجیت کے پاس

سے جو اپنی ماں پدماوتی (صحیح نام ہادی کرمی) کے ساتھ قلعہ رن تمبھور میں تھا، لوگ آئے جب میں گوالیار آنے لگا ہوں تو اس سے پہلے اسواک (اسوک) بکرماجیت کے سردار کے پاس سے اطاعت اور خدمت گزاری کے پیغام آئے تھے اور ستر لاکھ کے ملک عطا کرنے کی استدعا کی تھی، ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر رن تمبھور کا قلعہ خالی کر دے تو اس کی خواہش کے مطابق جاگیر داگذاشت کر دی جائے گی، یہ بات مقرر کر کے اس کے آدمیوں کو رخصت کر دیا تھا اور چوں کہ میں گوالیار جاتا تھا اس لیے کہہ دیا تھا کہ فلاں دن گوالیار میں حاضر ہو، یہ لوگ وقت مقررہ سے کئی دن پیچھے آئے، اسواک پدماوتی ہی کا رشتہ دار ہے اس لیے یہ کیفیت دونوں ماں بیٹوں سے بیان کی، دونوں نے اسواک سے متفق رائے ہو کر اطاعت اور شرط قبول کر لی، رانا سانگا کے پاس سلطان محمود (خلجی) کا ایک تاج، کلاہ، زریں کمر بند تھا، جب اس نے سلطان محمود کو پکڑا تھا یہ چیزیں لے کر چھوڑ دیا، وہ تاج وغیرہ بکرماجیت کے پاس تھا، اس کے بڑے بھائی نے جواب اپنے باپ رانا کا جانشین ہے اور چتوڑ پر قابض ہے، ان چیزوں کو بھیجنے اور رن تمبھور کے بدلہ میں بیاناہ لینے کو کہلا بھیجا، میں نے بیاناہ دینا تو منظور نہ کیا، مگر شمس آباد عوض میں دینا قبول کر لیا، اسی دن بکرماجیت کے دو آدمیوں کو خلعت دے کر رخصت کیا اور کہہ دیا کہ نو دن میں بیاناہ آ جاؤ۔

(تزک بابری اردو ترجمہ ص ۳۳۳)

اسی کے بعد بابر گوالیار پہنچا تو اس کے مندر کی سیر کو بھی گیا، اس کا ذکر لطف ولذت

کے ساتھ کرتا ہے:

”میں نے گوالیار کے بت خانہ کی سیر کی، بت خانہ میں بعض دوہرے

اور بعض تہرے دالان ہیں، مگر اگلی وضع کے نیچے نیچے ان کے ازارہ کے پتھروں

میں مجسم بت کندہ کیے ہوئے ہیں، بت خانے کے بعض ضلعے مدرسوں کی وضع کیے ہیں، صدر مقام میں ایک بڑا اونچا برج ہے جس کے حجرے ایسے ہیں جیسے مدرسوں کے حجرے ہوتے ہیں، ہر حجرہ کے اوپر پتھر کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں، حجروں میں نیچے کی جانب کے پتھروں میں بت تراشے ہیں۔“

(اردو ترجمہ ص ۳۳۳)

وہ بت شکن ہونے کے بجائے جس طرح مزے لے لے کر اس بت خانہ کا ذکر کرتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طے کر چکا تھا کہ جہاں بانی میں اس کو اس قسم کی رواداری کا اظہار کرنا ضروری ہے۔

بابر کی مرنجاں مرنج طبیعت سے موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی متاثر ہیں، مثلاً رام پرشاد تریپاٹھی لکھتے ہیں کہ بابر اپنے مذہب کا تو بڑا احترام کرتا، علما اور فقہا کی بڑی عزت کرتا لیکن وہ اپنے سیاسی معاملات میں ان کو دخل دینے نہیں دیتا اور نہ کسی فرقہ دارانہ مشورہ کو قبول کرتا، اس کے دربار یا نجی صحبت میں مذہبی یا طبقاتی اختلافات رونما نہیں ہوتے، مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہ تھی بلکہ اس کی شوکت غیر مسلم رعایا اور خصوصاً راجپوتوں کے ساتھ اس کی مذہبی رواداری میں بھی تھی، پھر اس زمانہ میں کلچر کو جو فروغ ہوا وہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہے، اکبر کو اس عظیم مرتبہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن اس پالیسی کا بیج اس کے ممتاز دادا ہی کی حکومت میں ڈال دیا گیا تھا، ایک ایسی نئی سلطنت قائم ہوئی جس کی سیاست میں مذہبی اور طبقاتی اختلاف کا کوئی دخل نہیں رہا۔



## ہمایوں

ہمایوں کو جم کر ہندوستان میں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن یہ واقعہ ذکر کرنے کے لائق ہے کہ جب وہ ہندوستان کی سلطنت کھو کر ایران میں مقیم تھا تو ایران کے بادشاہ طہماسپ نے اس سے ایک موقع پر پوچھا کہ ملک کے لوگوں نے اس کا کیوں ساتھ نہیں دیا؟ ہمایوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر لوگ غیر مذہب کے ہیں، اس سے رفاقت ممکن نہ ہو سکی، یہ سن کر شاہ طہماسپ نے پھر پوچھا کہ ہندوستان میں کون سا گروہ صاحبِ فیصلہ داعیان ہیں؟ ہمایوں نے جواب دیا کہ افغان اور راجپوت، شاہ طہماسپ نے پھر پوچھا کہ کیا ان دونوں گروہوں میں باہمی اخلاص ہے؟ ہمایوں نے کہا ”نہیں!“ پھر شاہ طہماسپ نے کہا کہ خدا کی مدد سے آپ کی حکومت ہندوستان میں پھر قائم ہو تو افغانوں کو تو تجارت اور حرفت میں لگا دیں اور راجپوتوں کو دلاسا اور محبت کے ساتھ شریک حال کریں، کیوں کہ ان کی تسخیر قلوب کے بغیر حکومت محال ہوگی، (تذکرۃ الخوانین ج ۱ ص ۱۰۴-۱۰۳ آثار الامراج ص ۶۱۹) ہمایوں کو تو راجپوتوں سے میل جول بڑھانے کا موقع نہیں ملا لیکن اکبر نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا جس سے اس کے دور کی تاریخ بڑی تابناک ہو گئی۔

ڈاکٹر ایس۔ کے بنرجی نے اپنی کتاب ”ہمایوں بادشاہ“ میں اس کے مذہبی

عقائد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ وہ سنی اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کا پیرو تھا لیکن دوسرے عقائد والوں کے ساتھ بڑی رواداری کا برتاؤ رکھتا تھا، اس کے ساتھ بہت سے شیعہ اور ایرانی امرار ہے اس لیے وہ شیعیت کی طرف مائل ہو گیا تھا..... اس کا ضمیر شاید اس لحاظ سے بھی مطمئن رہا کہ بابر نے ایک موقع پر سمرقند کی مسجد کے منبر پر شیعوں کا خطبہ پڑھا تھا، پھر وہ اپنے باپ ہی کی طرح شیعوں کے اماموں کی عزت کرتا تھا..... وہ اپنی ہندو رعایا کی طرف بھی مائل رہا، اس کے باپ کی یہ بھی نصیحت تھی کہ وہ ذبیحہ گاؤ بند کرادے اور مندروں کا انہدام نہ کرے، اس نصیحت نے اس کو اعتدال پسند بنا دیا تھا، اس لیے وہ عام ہندوؤں اور راجپوتوں کی ریاستوں سے اچھے تعلقات رکھتا تھا اس کو چوسا میں شکست ہوئی تو مراجعت کے وقت ایک ہندو راجہ بیربھن نے اس کی مدد کی، پھر امرکوٹ کی راجپوت ریاست ہی میں اکبر پیدا ہوا، مالدیو تو ہمایوں کی مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن جب سیاسی صورت حال بدل گئی تو وہ مدد نہ دے سکا، شیرشاہ مالدیو سے اسی لیے برسرا پیکار ہوا کہ اس نے ہمایوں کی ہمت افزائی کی تھی۔ (ہمایوں بادشاہ ج ۲ ص ۵۶-۳۵۳)

ملا عبد القادر بدایونی نے ہمایوں کے مذہبی عقیدہ کے سلسلہ میں ایک دل چسپ لطیفہ لکھا ہے جس سے اس بادشاہ کی مذہبی رواداری کا اندازہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں کہ جب ہمایوں بادشاہ کابل میں اپنے تخت و تاج کو پھر سے واپس لینے کا ارادہ کر رہا تھا تو اس زمانہ کے ایک مشہور مفسر اس سے ملنے کے لیے آئے، ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا، ایک روز شیخ حمید اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر بولے کہ میرے بادشاہ آپ کے سارے لشکر کو اب میں شیعہ دیکھتا ہوں، ہمایوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس مرتبہ ہر جگہ آپ کے لشکریوں کے نام یار علی، کفش علی، حیدر علی وغیرہ پاتا ہوں، کسی اور خلیفہ کا نام ان کے نام کے ساتھ نہیں پاتا ہوں، بادشاہ کو غصہ آ گیا، وہ بڑا حلیم تھا لیکن اپنے حلم کو نظر انداز کر کے غضبناک ہو کر بولا: ”میرے دادا کا نام تو عمر شیخ تھا اور دوسری بات تو میں

نہیں جانتا ہوں، یہ کہہ کر حرم میں چلا گیا اور جب واپس آیا تو بڑی نرمی اور مہربانی سے شیخ کو اپنے صحیح عقیدے کی اطلاع دی، (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۶۸) اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ میں سنی رہا لیکن اس کے ارد گرد زیادہ تر شیعہ امرا ہی رہے، اس لیے اپنی رواداری میں ان کے مسلک کو برداشت کرتا رہا جس سے اس پر شیعیت کا الزام آ گیا۔

چتوڑ پر جب گجرات کے بہادر شاہ نے حملہ کیا تو مہاراجہ سانگا کی بیوہ رانی کرناوتی (پاکرتی) نے ہمایوں کو راکھی بھیج کر اپنا راکھی بند بھائی بنا لیا جو اس زمانہ میں بنگال میں تھا، وہ بنگال کی مہم چھوڑ کر چتوڑ کی طرف روانہ ہوا، گو اس وقت وہاں پہنچا جب رانی موت سے دو چار ہو چکی تھی، مگر ہمایوں نے بہادر شاہ کو شکست دے کر یہ علاقہ رانی کرناوتی کے لڑکوں کے لیے محفوظ کر دیا، ٹاڈ نے اپنی مشہور کتاب میں اس واقعہ کو بڑے ولولہ انگیز انداز میں لکھا ہے کہ کس طرح ہمایوں اپنی راکھی بند بہن کی خاطر مدد کو پہنچا، وہ تو یہاں تک لکھ گیا ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے اودے پور سے تعلقات راجپوتوں کی روایت کے مطابق قائم رکھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں اودے پور کی مہارانی کو جو خطوط لکھے ان میں دو اس کے پاس ہیں، ان میں طرز تحریر و انشا کے لطیف اور پاکیزہ نمونے کے ساتھ راجپوتوں سے تعلقات کی روایت بھی برقرار ہے وہ مہارانی کو پیاری، نیک خصلت بہن، لکھ کر مخاطب کرتا ہے اور اس کی خیریت کا خواہاں ہوا ہے (ٹاڈ ج ۱ ص ۲۳۳-۲۳۲) ہمایوں نے مہارانی کرناوتی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اب افسانوں اور ڈراموں کا موضوع بنا ہوا ہے گو موجودہ دور کے بعض مورخین اس واقعہ کو کچھ اور رنگ دے کر اس کی جذباتیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمان اہل علم روز بروز ہندوؤں کے علوم و فنون کی طرف بھی مائل ہوتے جا رہے تھے، ہمایوں ہی کے عہد میں تاج الدین مفتی الممالک نے سنسکرت کی مشہور کتاب ہتو پدش کا ترجمہ فارسی میں 'مفرح القلوب' کے نام سے کیا اور ہمایوں ہی کے نام سے معنون

کیا (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری کالم ۱۱۰۳) محمد گوالیاری نے سنسکرت کی دوسری مشہور تصنیف امرت کنڈکا ترجمہ فارسی میں 'بحر الحیات' کے نام سے کیا، اس میں برہمنوں کے مذہبی عقائد اور فلسفیانہ خیالات پر مباحث ہیں۔

(فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۱ ص ۱۵۹)



## شیر شاہ

اس دور میں شیر شاہ (وفات ۱۵۴۵ء) نے اپنی رواداری اور فراخ دلی کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا، اس سے ہندو مسلم دونوں خوش رہے، اس کی فوج میں پیدل سپاہی اور بندو قچی تمام تر ہندو تھے، اس کے بہترین سپہ سالاروں میں پریم جیت گورتھا، اس نے ہمایوں کو ہندوستان سے در بدر کرنے میں اس کا تعاقب بھی کیا (الیٹ ج ۴ ص ۳۸۳) گوالیار کا راجہ رام ساہ شیر شاہ کی حمایت میں لڑتا رہا۔

رائے سین کے راجہ پورن مل کے خلاف راجہ رام ساہ شیر شاہ کی حمایت کرتا رہا، راجہ پورن مل نے اپنی شکست تسلیم کر کے اپنے کو شیر شاہ کے حوالہ کرنا چاہا تو رام ساہ ہی اس کو شیر شاہ کے پاس لے جانے کے لیے پہنچا، مگر اس نے شیر شاہ کے ایک فوجی سردار شجاعت خان کے ساتھ شیر شاہ کے پاس جانا پسند کیا، شجاعت خان رائے سین کے قلعہ میں پہنچا تو راجہ پورن مل کی رانی رتناولی اپنے محبوب شوہر سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی تھی، اس لیے اس نے شجاعت خان کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے شوہر کی جدائی میں اس وقت تک برابر برت رکھے گی اور قلعہ کی تفصیل پر بیٹھی رہے گی، جب تک کہ وہ اس کو واپس آتے نہ دیکھ لے گی، شجاعت خان نے



اس سے وعدہ کیا کہ اس کا شوہر بھیا پورن مل دوسرے دن واپس آجائے گا پورن مل شیر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو شیر شاہ نے اس کو ایک سو گھوڑے اور ایک سو شاندار خلعت عطا کیے اور اس کو قلعہ واپس جانے کی اجازت دے دی، بھیا پورن مل اپنے چھوٹے بھائی چتر بھج کو شیر شاہ کی خدمت گزاری کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گیا (الیٹ ج ۲ ص ۳۹۲) شیر شاہ نے پورن مل کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں، مگر ایک روایت وہ بھی ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان کی گئی ہے یہ تاریخ شیر شاہی، مصنفہ عباس خان کی روایت ہے۔

مؤرخوں کا بیان ہے کہ راجپوتوں کا ایک دستہ شیر شاہ کی فوج میں تھا، اس کا اعتراف موجودہ دور کے مؤرخ کا لکارنخن قانون گو نے بھی کیا جو یہ لکھتے ہیں کہ ”شیر شاہ کی فوج میں ہندوؤں کو باعزت عہدے ملتے رہے“ اس کے ہندو پیدل سپاہی اور بندوچی بکسریا کی نسل سے تھے، شیر شاہ ان پر شمالی صوبوں کے لشکریوں سے زیادہ بھروسہ کرتا۔“

(شیر شاہ از کا لکارنخن قانون گو، ص ۷۰-۳۶۹)

ڈاکٹر کا لکارنخن قانون گو شیر شاہ کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شیر شاہ نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا تھا جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کے لیے نہایت مناسب فضائل گئی، مسٹر ڈبلیو کروک کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ شیر شاہ پہلا حکمران ہے جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی اور یہ کام اس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا کہ سیاسی اتحاد مذہبی یکسانیت کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، اس نے یہ محسوس کیا کہ سارے ہندوؤں سے مذہب اسلام قبول کرانا محض حماقت ہے، چنانچہ اس نے نہ ہندو مذہب کے پیروؤں پر کسی قسم کی پابندی عائد کی اور نہ ان کے ساتھ ذلت آمیز رویہ اختیار کیا، اس کی مذہبی پالیسی میں بڑا اعتدال رہا،

اس نے نہ کسی مندر کو منہدم کیا اور نہ کسی بت کو توڑا، اس کی مذہبی پالیسی میں صرف رواداری ہی نہ تھی، بلکہ غیر جانبداری بھی تھی، تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جو باتیں حکومت کی طرف سے کی جاتی تھیں ان سب کو اس نے رکوا دیا، اگرچہ اس نے جزیہ لینا بند نہیں کیا لیکن کم از کم اس اسپرٹ میں اس کو عائد نہیں کیا جس کی تلقین قاضی مغیث الدین نے سلطان علاء الدین کے عہد میں کی تھی، شیرشاہ نے ہندو مذہب کا احترام ہر چیز میں ملحوظ رکھا، ہندوؤں کے لیے ہر سرائے میں علاحدہ انتظام تھا، شیرشاہ نے حکومت میں سیکولر اسپرٹ پیدا کی اگرچہ وہ مذہبی راسخ العقیدگی میں کسی دوسرے مسلمان سے کم نہ تھا لیکن اس نے اپنی حکومت کی پالیسی میں ظاہر نہیں ہونے دیا..... وہ پہلا حکمراں ہے جس نے مختلف مذاہب کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، یہ امتیاز اکبر کو دیا جاتا ہے اور شیرشاہ کے لیے یہ دعویٰ فضول سا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ بظاہر اس نے جزیہ لینا بند نہیں کیا، گائے کی دبیحہ کی مخالفت کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا، سنسکرت زبان کی کوئی ایسی سرپرستی نہیں کی جس سے ہندو اور مسلمان دونوں میں کلچرل اتحاد اور علمی یگانگت پیدا ہوتی، اس نے ہندو مسلمانوں میں شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرتے کی کوشش نہیں کی، یہ تمام باتیں اکبر کی جانب منسوب ہیں لیکن شیرشاہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھا، اس نے علاء الدین کے چراغ کے ذریعہ ایک رات میں کوئی ہوائی قلعہ تیار کرنے کی سعی نہیں کی بلکہ ایک ایسا جاندار اور عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جس سے ہندوؤں میں سیاسی اور اقتصادی خوشحالی خود بخود پیدا ہو گئی، اس نے ہندو مسلمان کو متحد رہنے پر آمادہ کیا، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈالی، اس کے ابتدائی دور کی جتنی ضروری چیزیں تھیں ان سب کو عمل میں لانے

کی کوشش کی اس نے ہندوستانی قومیت کے لیے زمین ہموار کر کے اس میں بیج بھی ڈال دیا لیکن افسوس ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہا کہ اپنی کوششوں کو بار آور دیکھتا، اس نے جو کچھ کیا اگر اس سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتا تو نا کام رہتا اگر وہ جزیہ لینا بند کر دیتا یا ذبیحہ گاؤں کو ادیتا تو اس لحاظ سے انتہائی نا عاقبت اندیشی ہوتی، اس قسم کے اقدام ریاست کے لیے مضر ہوتے لیکن اس کے باوجود ہندو مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔

(شیر شاہ ص ۳۱۰-۳۱۶)

اے۔ ال سری داستوانے اپنی کتاب 'مغل امپائر' میں لکھا ہے کہ شیر شاہ کا تدبیر اس میں تھا کہ اس نے سیاست اور مذہب کو خلط ملط نہیں کیا تھا، اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوؤں کو نظر انداز کر کے حکومت نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے اپنے ملکی اور فوجی نظام میں ہندوؤں کا پورا تعاون حاصل کیا۔ (مغل امپائر، سکندراڈیشن، ص ۱۱۸-۱۱۷)

ڈاکٹر پی۔ سرن رقم طراز ہیں کہ شیر شاہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی کیوں کہ ان کو دینا پڑا لیکن شیر شاہ نے تو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ان کو ایسی مکمل مذہبی آزادی دی کہ اس کے بعد ہندو اپنے مذہبی اور معاشرتی قوانین بالکل آزاد رہے، ان پر اسلامی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، گریڈی نے لکھا ہے کہ مسلمان فاتحین کا رویہ یورپ کے فاتحوں سے مختلف رہا وہ نہ صرف اپنے قوانین بلکہ اپنی حکومت کے اندر رہنے والے غیر مسلموں کے قوانین کی پابندی سختی سے کرتے جو غیر مسلم ان کی حکومت کو تسلیم کر لیتے تو وہ پھر اپنے مذہبی معاملات میں بالکل آزاد رہتے بلکہ مسلمانوں کے خلاف ضرورت کے وقت ان کے تحفظ کا سامان کیا جاتا، غیر مذہبی جھگڑوں میں ان پر حکومت کا قانون تو عائد کیا جاتا لیکن جائداد وغیرہ کے معاملہ میں ان ہی کے قوانین کی پابندی کی جاتی اور ان کے پنڈتوں اور ہندو قوانین کے ماہروں سے مشورے کیے

جاتے، اس کی وضاحت فتاویٰ عالمگیری میں بھی کر دی گئی ہے، (دی پرووٹیشنل گورنمنٹ آف دی مغلز، از ڈاکٹر پی۔ سرن، ص ۳۸-۳۳۷) اور یہ امر واقعہ ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد سے لے کر مغلوں کے آخری دور حکومت تک میں ہندوؤں کے پرسنل لا اور مذہبی قوانین میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی اور ان کے مذہبی قوانین و جذبات کا احترام ہر حال میں کیا گیا، ڈاکٹر پی۔ سرن نے اعتراف کیا ہے کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ شیر شاہ اور مغل حکمرانوں کے اعلیٰ ترین اور انتہائی ضروری فرائض میں لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا داخل تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے پورے اخلاص کے ساتھ کوشش کی اور سچ تو یہ ہے کہ اس میں وہ کامیاب رہے۔ (ایضاً: ص ۳۵۷)

علمی رواداری: ملک محمد جائسی (ولادت ۱۲۹۸ء) نے شیر شاہ ہی کے عہد ۱۵۲۲ء میں ہندی میں پدمات لکھ کر اپنی لسانی اور مذہبی رواداری کا ثبوت دیا، اس کے متعلق بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ قدرتِ زبان اور سادگی بیان کے لحاظ سے یہ کسی طرح راماین سے کم نہیں، پدمات کے علاوہ ملک محمد جائسی نے اکھراوٹ اور چتر ریکھا لکھیں، ملک محمد جائسی نے ہندی زبان میں جو اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے مذہبی تعصب سے آزاد ہو کر اس ملک کی زبان کو اپنایا اور اس میں ایسا جوہر دکھایا کہ خود ہندوؤں کو اس پر فخر ہو گیا۔



## اسلام شاہ

شیرشاہ کے لڑکے اسلام شاہ (۱۵۵۵ء-۱۵۴۵ء) نے اپنے فراخ دل باپ کی رواداری کو اپنے عہد حکومت میں قائم رکھا، اس نے اپنے باپ ہی کی طرح ہندوؤں کو ملازمتیں دیں، اس کے محکمہ مال میں ہندو ہی تھے، اسی لیے ایک روز اس کے ایک مقرب امیر محمد فرملی نے اس سے تفریحاً کہا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ آسمان میں تین خریطے آئے ایک میں خاک تھی، دوسرے میں زرتھا، تیسرے میں کاغذ تھا، خاک کا خریطہ سپاہیوں کے سر پر گرا اور کاغذ ہندوؤں کے گھر گیا اور کاغذ شاہی خزانہ میں رہا۔

(منتخب التواریخ ج ۱، ص ۳۸۷)

اسلام شاہ نے اپنے باپ کے رفاہ عام کے کاموں کو برقرار رکھا، شیرشاہ نے ہر دو کوس پر سرائیں بنوائی تھیں، اسلام شاہ نے ترقی دے کر ہر دو سرائیوں کے درمیان ایک سرائے اور بنوائی، اس میں ہندو مسلمان مسافروں کے تمام ضروری سامان فراہم کیے، ہر سرائے میں کمرہ، کنواں اور باورچی خانہ ہوتا جس میں بچے ہوئے کھانے کے علاوہ جنس بھی موجود رہتی، شیرشاہ نے سترہ سوسرائیں بنوائی تھیں، اسلام شاہ نے ان کو بڑھا کر

چونتیس سو کر دیا، اس نے ہر سرائے میں خیرات تقسیم کرنے کا بھی انتظام کیا، اس کا یہ بھی حکم تھا کہ غریب مسافروں اور فقیروں کی ضروریات کی تمام چیزیں سرائے سے ملتی رہیں، شیر شاہ نے کار خیر کے جتنے ادارے قائم کیے، تعلیم گاہوں اور مذہبی اداروں کی جو جاگیریں دیں، یا جو باغات لگائے ان سب کو اسلام شاہ نے برقرار رکھا۔ (تاریخ داؤدی، ص ۱۶۵)

وہ علوم و فنون کا بھی بڑا قدردان رہا، فارسی کے ساتھ اس نے ہندی زبان کی بھی سرپرستی کی، ہندی کے مشہور شاعر اور ماہر موسیقی سوردا اس کو بھی اس کی سرپرستی حاصل رہی، اس کے دربار میں شاہ محمد فرملی ہندی کے ایک ممتاز شاعر تھے، بابر کے لڑکے شہزادہ کامران کی رائے تھی اگر شاہ محمد فرملی ہندی کے بجائے فارسی کا شاعر ہوتا تو اس کی اپنی شاعرانہ صلاحیت کی بدولت عالمگیر شہرت حاصل ہوتی۔

سوری خاندان کی مذہبی رواداری اپنی انتہا کو اس وقت پہنچ گئی جب ہمیو بقال وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہوا، وہ قصبہ ریواڑی کا رہنے والا ہندو بقال تھا، اسلام شاہ کے عہد میں وہ محض ایک دوکاندار تھا، پھر توشہ خانہ کانگراں ہو گیا، اس کے بعد بازار کا کوتوال بنایا گیا، عادل شاہ کے عہد میں ترقی کر کے وزارتِ عظمیٰ تک پہنچ گیا، اپنی ہوش مندی سے اپنے شاہی آقا پر اتنا غالب ہو گیا کہ وہی با اختیار بنا رہا جس امیر کو جہاں چاہتا بھیج دیتا، اس کی جاگیر اپنی مرضی سے واپس لے لیتا یا بخش دیتا، وہ بظاہر بڑا ہی نحیف اور کمزور تھا، گھوڑے کی پیٹھ پر مشکل سے بیٹھتا کبھی نیام میں تلوار نہیں رکھی لیکن اپنے غیر معمولی دماغ سے اپنے شاہی آقا کے لیے بائیس لڑائیوں میں فتح پائی، اسی کی بدولت عادل شاہ افغان سلطنت کا مالک بنا رہا، میدانِ جنگ یا مجلسِ مشورت میں بھی نمایاں رہتا، منتخب التواریخ میں ہے کہ ۹۶۲ھ۔

۱۵۶۳ء عادل شاہ کی سلطنت میں زبردست قحط پڑا لوگ ایک روٹی پر جان دیتے لیکن اس کے لشکر میں پانچ سو ہاتھیوں کو روزانہ شکر اور گھی کا راتب ملا کرتا تھا، وہ تمام افغان امرا کو اپنے یہاں بلا کر ایک وقت کھانا کھلایا کرتا تھا، کھلاتے وقت کہتا: بڑے بڑے لقمے اٹھاؤ اگر کسی کو

کم کھاتے دیکھتا تو اس کو گالیاں دے کر کہتا: تو آج سستی سے کھا رہا ہے، کل اپنے مغل دامادوں سے کس طرح لڑے گا، افغان یہ گالیاں برداشت کرتے تھے، (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۳۰) ہیورفتہ رفتہ اتنا حاوی ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب دہلی اور آگرہ پر اسی کی حکومت قائم ہو جائے گی، اکبر کی جانشینی کے بعد پہلے اس نے تغلق آباد کے پاس مغلوں سے ٹکر لی اور دہلی پر قابض ہو گیا، اپنا خطاب راجہ بکر ماجیت اختیار کر لیا پھر ۹۶۴ھ - ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں کمسن اکبر سے لڑنے کے لیے اتر، مغل دور کے مورخین اس کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتے ہیں، کیوں کہ وہ مغلوں کا حریف بنا رہا، ابوالفضل نے بھی اس کا ذکر حقارت سے کیا ہے، مگر اس کو بھی اعتراف ہے کہ پانی پت کی جنگ میں اس کے ساتھ راجپوت بھی تھے اور افغان بھی، وہ بڑی بہادری اور تہور سے لڑا، لڑتے وقت اس نے اکبر کی فوج کے بہت سے بہادر سپاہیوں کو پامال کیا مگر آخر میں خود بھی مارا گیا۔

(اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۴۰)



## اکبر

اکبر کی رواداری: اکبر ۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء کی رواداری کے غلط قسم کے اقدام سے مسلمانوں کے دلوں کو جو دکھ پہنچا اس کا ذکر آگے آئے گا لیکن اس کی رواداری سے اس دور میں جو ایک خوشگوار فضا قائم ہوئی، ہم اس کی تفصیل پہلے پیش کرتے ہیں:

اکبر نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں راجپوتوں کے دلوں کی تسخیر کے لیے تمام ممکن ذرائع اختیار کیے، ان سے شادی بیاہ کر کے رشتے بھی قائم کیے، اس کا نکاح انبیر کے کچھواہہ خاندان کے راجہ بہار ایل کی لڑکی یعنی راجہ بھگوان داس کی بہن سے بھی ہوا، اس کے بطن سے شہزادہ سلیم پیدا ہوا جو آگے چل کر نور الدین جہانگیر کے لقب سے اس کا جانشین ہوا، اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی مان بائی سے کی، اکبر نامہ جلد سوم، ص ۱۰۵-۱۰۴ اور آثار الامرا (ج ۲ ص ۱۳۰) میں دہرایا گیا ہے، (نیز دیکھو ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۹۷-۹۶) راجہ بھگوان داس جب اپنی بیٹی کو رخصت کرنے لگا تو اس نے اکبر سے کہا:



”ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم ناند گلام رہے۔“

اکبر نے فوراً جواب دیا:

”تمہاری بیٹی تمہارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رہے۔“

(مغل اور اردو از نصیر حسین خیال ص ۱۳-۱۲)

مولانا شبلی نے اس شادی کی تقریب کو منظوم کیا ہے جس کے آخری تین اشعار یہ ہیں:

دلہن کے گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے کہ کوسوں تک زمیں پر فرشِ دیبائے مشجر تھا  
دلہن کی پاکی خود اپنے کندھوں پر جولائے تھے وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا  
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا  
محبت و مودت: راجہ بھگوان داس ترقی کر کے پنج ہزاری پنج ہزار سوار منصب دار بن گیا  
تھا، وہ آخر وقت تک اکبر کے دامِ اخلاص و محبت کا اسیر رہا، اکبر کے ۲۳ جلوس میں پنجاب  
کا صوبہ دار اور سپہ سالار مقرر ہوا، اسی کے بعد شہزادہ سلیم کی شادی اس کی لڑکی سے ہوئی جس  
کو شاہ بیگم کا خطاب دیا گیا، اسی سے خسرو پیدا ہوا، ۹۹۴ ہجری میں وہ کابل کا صوبہ دار مقرر  
ہوا، ۹۹۵ ہجری میں حرمِ سرا اور محلوں کا انتظام اس کے سپرد ہوا، ۹۹۷ ہجری میں لاہور کی  
نگرانی پر مامور ہوا، اکبر کے ساتھ میواڑ کے رانا کے خلاف بھی برسرِ پیکار ہوا، بڑی بڑی  
مہموں میں راجہ بھگوان داس اکبر کے ساتھ ضرور رہتا، ۹۷۶ھ-۱۵۷۱ء میں اکبر گجرات کی  
مہم پر گیا تو راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ تھے، لڑائی کے موقع  
پر اکبر اپنے خاص گھوڑے نور بیضا پر سوار ہو کر میدانِ جنگ جانے لگا تو گھوڑا ایک بیٹھ  
گیا سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہیں ہوا لیکن راجہ بھگوان داس نے  
فراست سے کام لیا اور آگے بڑھ کر اکبر سے مخاطب ہو کر بولا: ”فتح مبارک ہو، اکبر نے سن  
کر کہا: ”ایسا ہی ہو، لیکن تم کیسے سمجھے؟“ راجہ نے جواب دیا کہ ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ  
جب فوجِ مقابلہ کے لیے تیار ہو اور سینا پتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے تو فتح اسی کی

ہوتی ہے، یہ سن کر تمام لشکریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی جب جنگ شروع ہوئی تو اکبر نے جو راجہ بھگوان داس کے ساتھ ایک ٹیلہ پر کھڑا ہو کر جنگ کا معاینہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگوان داس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہراول پر دباؤ زیادہ ہے اور بے طور ہوا چاہتا ہے، چلو ہم تم مل کر جا پڑیں، یہ کہہ کر دونوں نے گھوڑوں کی باگ اٹھائی اور ان کا یہ دھاوا کامیاب رہا۔

اسی جنگ میں اکبر ایک مقام پر کھڑا ہو کر دشمنوں پر تیر چلا رہا تھا، راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ اس کے پاس تھے، یکا یک دشمن کے تین لشکری آگے بڑھے ایک راجہ بھگوان داس کی طرف لپکا اور دواکبر پر حملہ آور ہوئے، راجہ بھگوان داس نے تو دشمن کو مار بھگایا، اکبر دونوں دشمن لشکریوں سے برس پر پیکار ہوا تو مان سنگھ اکبر کی مدد کے لیے پہنچا ہی چاہتا تھا کہ اکبر نے للکارا کہ وہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے اور خود اپنا گھوڑا اڑا کر دونوں دشمنوں کے نرغے میں لینا چاہا، راجہ بھگوان داس نے چلا کر مان سنگھ سے کہا کہ کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہو آگے بڑھو، مان سنگھ نے کہا: مہابلی خفا ہوتے ہیں راجہ بھگوان داس نے چھلا کر کہا: یہ وقت خفگی دیکھنے کا نہیں ہے، اس عرصہ میں اکبر نے دونوں دشمنوں کو مار بھگایا (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۹ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۴۳، دربار اکبر از محمد حسین آزاد ص ۳۲، لکھنؤ ایڈیشن، ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام از خاکسار مرتب ص ۱۰۸-۱۰۷)

ذخیرۃ الخوانین جلد اول ص ۱۰۳ میں ہے کہ بھگوان داس کے اعمال خیر میں لاہور کی جامع مسجد ہے کہ جس میں اکثر لوگ اس وقت تک نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔

(نیز دیکھو آثار الامراج ۲ ص ۱۳۰)

راجپوتوں کی دل جوئی: اسی لڑائی میں جب اکبر اپنی فوج کی صفیں درست کر رہا تھا تو دیکھا کہ راجہ بہار مل کا بھتیجا راجہ جے مل کچھواہہ اپک وزنی بکتر پہنے ہوئے ہے، اکبر نے وہ بکتر اتروالیا اور اپنے خاصہ کی زرہ پہنادی راجہ جے مل اس خصوصی رعایت سے بہت مسرور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد اکبر نے جو دھ پور کے راجہ مالدیو کے پوتے راجہ کرن کو دیکھا

کہ اس کے پاس نہ زرہ ہے نہ بکتر، اس نے راجہ جے مل کا بکتر اس کو پہنا دیا راجہ جے مل کا باپ روپ سی بھی لڑائی میں شریک تھا، اس کو یہ ناگوار گذرا کیوں کہ راجہ کرن کے خاندان سے اس پشتینی عداوت چلی آرہی تھی، اس نے اکبر کو کہلا بھیجا کہ وہ بکتر میرے بزرگوں کی یادگار ہے اور بڑا مبارک ہے، اس لیے مجھ کو واپس کر دیا جائے، اکبر معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا، روپ سی کے پاس کہلا بھیجا کہ خاصہ کی زرہ اور بھی مبارک ہے لیکن راجہ روپ سی کا غصہ فرو نہ ہوا، اس نے اشتعال میں اسلحہ جنگ اتار پھینک دیا اور کہا کہ میدان جنگ میں یوں ہی جاؤں گا، اکبر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے بھی اپنی زرہ اتارنے کا ارادہ کر لیا کہ جب میرے لشکری برہنہ ہو کر لڑیں گے تو میں کیوں کر زرہ بکتر میں چھپ کر میدان جنگ میں جاسکتا ہوں، راجہ بھگوان داس کو اس کی خبر ملی تو فوراً گھوڑا بڑھا کر جے مل اور روپ سی کے پاس پہنچا، دونوں کو سمجھا کر اور ہتھیار لگوا کر اکبر کے پاس لایا اور عرض کیا کہ روپ سی نے آج بھنگ زیادہ پی لی تھی، اسی کی لہر کی ترنگ میں تھا یہ سن کر اکبر کا تردد جاتا رہا۔

(اکبر نامہ، ج ۲ ص ۵۰-۴۹، آثار الامراج ۲ ص ۱۱۱)

راجپوتوں کی مثالی شجاعت: ایک موقع پر اکبر کی مجلس میں ہندوستان کے لوگوں کی مردانگی اور شجاعت کا ذکر آیا، راجپوتوں نے بڑھ چڑھ کر کہا کہ اگر دورا چپوت ایک دوسرے کے سامنے برچھے لے کر دوڑ پڑیں تو وہ دونوں برچھے کا سینہ میں پیوست ہو جانا پسند کر لیں گے لیکن کترانا پسند نہ کریں گے یہ سن کر اکبر کی مردانگی جوش میں آئی اس نے حکم دیا کہ اس کی تلوار ایک دیوار میں اس طرح نصب کی جائے کہ اس کا پھل باہر نکلا رہے، جب اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو وہ آگے بڑھ کر تلوار کی نوک اپنے سینہ میں پیوست کر لینا ہی چاہتا تھا کہ راجہ بھگوان داس کے لڑکے راجہ مان سنگھ نے دوڑ کر دیوار سے تلوار کو نکال کر دوڑ پھینک دیا، اکبر جھنجھلایا، مان سنگھ کو زمین پر دے مارا اس کشتہ کشتی سے اکبر کے انگوٹھے میں زخم آ گیا، اکبر کا ایک دوسرا درباری امیر مظفر خان سلطان نے جب یہ دیکھا تو اس نے اکبر کے

زخمی ہاتھ مروڑ کر مان سنگھ کو اس سے چھڑا لیا۔ (اکبر نامہ، ج ۳ ص ۳۰)

راجپوتوں کی مثالی وفاداری: راجہ مان سنگھ سے اکبر کو بہت محبت رہی، اس کو غایت محبت میں راجہ مرزا کہا کرتا تھا، راجہ مان سنگھ کو بھی اکبر سے والہانہ لگاؤ رہا، وہ میدان جنگ میں اکبر کے گھوڑے کی باگ سے اپنی باگ ملائے رکھتا، وہ اکبر کی خاطر رانا پرتاب سے بھی بڑی بہادری سے لڑا جس کے بعد ملا عبد القادر بدایونی کو یہ کہنا پڑا کہ ملا شیری کے اس مصرع کی تصدیق ہو گئی کہ:

ہندوی زندگی شمشیر اسلام

(منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۳-۳۳۲)

راجپوتوں پر اعتماد کلی: بہار میں پورن مل اور راجہ سنگرام اور اڑیسہ میں مین پوری کے راجہ کے خلاف راجہ مان سنگھ ہی کی نگرانی میں فوج بھیجی گئی، اس نے کابل اور زابلستان میں بھی جا کر اکبری اقبال کا پرچم لہرایا، اکبر نے اپنے درباری امیروں میں سب سے پہلے اسی کو ہفت ہزاری منصب دار بنایا جو اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز تھا، راجہ مان سنگھ سے پہلے کبھی کوئی فوج کسی ہندو فوجی سردار کی نگرانی میں کہیں نہیں بھیجی گئی تھی اور نہ کسی ہندو فوجی سردار نے مسلمانوں کے خلاف اپنی رہنمائی میں لشکر کشی کی تھی لیکن اکبر نے مان سنگھ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر مسلمانوں کا سارا رعب ہندوؤں کے دلوں سے نکال دیا۔

(مآثر الامراج ۲ ص ۱۷۲-۱۶۲)

مذہبی لگاؤ: راجہ مان سنگھ بھی اکبر کی محبت کا صلہ اپنی سرفروشی اور جاں بازی کا جو ہر دکھلا کر ادا کرتا رہا لیکن مذہب کے معاملہ میں اکبر کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا، ایک سال محرم کے مہینہ کے عاشورے کی رات تھی، اکبر اپنے خلوت خانے میں عبد الرحیم خاناناں اور راجہ مان سنگھ کے ساتھ بیٹھا تھا، اس زمانہ میں وہ دین الہی کا علم بردار بن چکا تھا لیکن مان سنگھ نے اس مذہب کو قبول کرنا پسند نہیں کیا تھا، خلوت میں موقع پا کر اکبر نے اس کو دین الہی کی

ترغیب دلائی لیکن وہ اخلاص و وفا کا پیکر بہت ہی بے تکلفانہ طور پر بول اٹھا کہ اگر اس مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو میں تو ہر موقع پر اپنی جان ہتھیلی پر لیے حاضر رہا ہوں پھر امتحان لینے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے، میں ہندو ہوں اگر آپ کہیں تو مسلمان ہو جاؤں، ان دونوں راستوں کے علاوہ کسی اور راستہ پر چلنا نہیں چاہتا ہوں یہ سن کر اکبر خاموش ہو گیا۔

(منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۶۴)

لشکریوں کے ساتھ رواداری: راجہ مان سنگھ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی مہم پر فوجی سردار بن کر جاتا تو وہ اپنے مسلمان لشکریوں کے لیے لشکر میں غسل کرنے کے لیے حمام اور نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے کپڑے گھیر کر مسجد کا بھی پورا انتظام کرتا اور ایک وقت کا کھانا بھی ان کو اپنی طرف سے کھلاتا، ایک بار وہ دکن کی مہم پر گیا تو پندرہ و بیچ ہزاری اور سترہ سو دوسرے منصب دار اس کے ساتھ تھے، ان ہی میں خان جہان لودی، خانخاناں عبدالرحیم خاں اور امیر الامرا شریف خاں بھی تھے یہ لشکر بالاگھاٹ میں مقیم ہوا تو سخت قحط پڑ گیا راستہ کی خرابی سے باہر سے رسد بھی نہیں پہنچی، ایک روپیہ میں بھی ایک سیر آٹا نہ ملتا، فوجی سرداروں میں مشورے ہوئے لیکن کوئی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، ایک روز راجہ مان سنگھ نے ان سے کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک وقت آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا لیکن اب جبکہ داڑھی سفید ہو گئی اپنی وضع داری کو ختم کرتے بن نہیں پڑتا، البتہ ایک پان ہے آپ لوگوں کو پیش کروں تو آپ لوگ قبول فرمائیں، خان جہاں لودی بول اٹھا کہ میں قبول کروں گا اس کے بعد تمام منصب داروں نے یہی کہا، راجہ مان سنگھ نے اسی رات کو ہر بیچ ہزاری کو ایک سو اور اسی حساب سے ایک صدی تک کے تمام منصب داروں کے لیے روپیے ایک تھیلے میں رکھ کر ان کے پاس بھیجے اور ہر تھیلے پر علاحدہ علاحدہ نام لکھ دیے، یہ سلسلہ چار مہینے تک بلا ناغہ قالم رہا اور جب لشکریوں میں غلہ پہنچا تو اس کے حکم سے اسی نرخ میں

فروخت ہونے لگا جس میں انبیر فروخت ہوتا تھا۔

(ذخیرۃ الخوانین ج ۱ ص ۱۱۰-۱۰۹، آثار الامراج ۲ ص ۶۹-۱۶۸)

ٹوڈرل کے ساتھ شاہانہ عنایت: راجہ ٹوڈرل اکبر کا بڑا ممتاز درباری امیر تھا اس نے اکبر کی پوری مملکت کی مالی جمع بندی کر کے بڑی شہرت حاصل کی، چار ہزاری منصب پر بھی فائز ہوا، کھتری تھا لیکن فوجی مہمات میں بڑی کارگزاریاں دکھاتا رہا، پٹنہ، بنگال اور گجرات میں اس کے فوجی اور انتظامی کارناموں سے اکبر بہت متاثر تھا وہ موٹمن الدولہ اور عمدۃ الملک کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، ابوالفضل نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ راستی، خدمت گذاری، معاملہ شناسی، مردانگی، کارگذاری اور سربراہی کے اعتبار سے یگانہ روزگار تھا لیکن ابوالفضل کو اس سے یہ شکایت تھی کہ وہ بڑا کینہ پرور اور متعصب بھی تھا، اس لیے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر اس میں مذہبی تعصب اور کینہ پروری نہ ہوتی تو اس کا شمار معنوی بزرگوں میں ہوتا، اس کو معمولی ناگواری بھی ہو جاتی تو اس کا انتقام ضرور لیتا، ابوالفضل اس کے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھتا تھا اس لیے اس نے ایک بار اکبر سے ٹوڈرل کی شکایت کی جس سے شاید یہ مراد تھی کہ اس کو اس کے عہدے سے ہٹایا جائے، اکبر ابوالفضل کو بہت محبوب رکھتا تھا لیکن اس کی شکایت سن کر اس کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ جس کو نواز دیا اس کو اس کے رتبہ سے گرانا مناسب نہیں، اس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام دھارد تھا جو اکبر کے زمانہ میں ہفت صدی منصب پر تھا وہ گھوڑوں کی نعل بندی سونے اور چاندی کے نعلوں سے کرتا تھا۔

(آثار الامراج ۲ ص ۱۲۷)

راجہ پیر برکی موت پر غم: اکبر کا بہت ہی محبوب درباری راجہ پیر بر تھا اس کا اصل نام ہمیش داس تھا، بھانٹ تھا، اپنی مفلسی اور ناداری کی وجہ سے مال دار لوگوں کی تعریف و ستائش کر کے زندگی بسر کرتا تھا جب اکبر کے دربار میں پہنچا تو اپنی ذکاوت، فہم، سخن سنجی اور لطیفہ گوئی سے اس کا خاص مذہم ہو گیا اور دربار کے تمام مقربین سے بازی لے گیا، اکبر سے ایسی

بے تکلفی بڑھی کہ آرام کے وقت وہ حرم سرا کے اندر بھی بلایا جاتا وہ اپنے چٹکوں اور لطیفوں سے اس کو خوش کیا کرتا تھا، اکبر دربار میں کسی سے گفتگو کرتا تو اکثر اس کا روئے سخن پیر برہی کی طرف ہوتا تھا، رفتہ رفتہ دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے اسی لیے اکبر نے فتح پور سیکری میں اس کا مکان اپنے محل کے بغل میں تعمیر کرایا، یہ خوبصورت اور شاندار مکان فتح پور سیکری میں اس کے محل کے پاس اب بھی موجود ہے۔

وہ ہندی اشعار بھی کہتا تھا، ذخیرۃ الخوانین میں اس کے ذکر میں ہے کہ اس کو علم موسیقی میں بڑی دستگاہ تھی، ہندی میں اس کی چکری، کامی، بشن پد، سنیکار، موابہ اور دوہرہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، (ص ۱۸۴) اکبر نے اس کو کب راءے کا خطاب دیا جو تقریباً ملک الشعراء کے ہم معنی ہے، اس کو صاحب السیف والقلم کا بھی خطاب دیا گیا تھا اور ہمیشہ اس سے راجہ پیر برہو گیا، پیر برہو کے معنی شجاع کے ہیں۔

اکبر نے اپنے ستائیسویں سال جلوس میں اپنے خاص خاص امرا کو بلا کر حکومت کے نظم و نسق کی ترقی اور بہتری کے لیے مشورے لیے تو راجہ پیر برہو نے اس موقع پر مشورہ دیا کہ کچھ ایماندار اور جفاکش افراد مقرر کیے جائیں تاکہ وہ اس کی نگرانی کریں کہ مظلوموں کی فریاد صحیح طور پر سنی جاتی ہے اور عدل و انصاف میں غیر جانبداری برتی جاتی ہے اور پھر ان معاملات کی تحقیقات کر کے بادشاہ کو باخبر رکھیں، (اکبر نامہ ج ۳ ص ۳۸۰) اکبر نے اس مشورہ کو قبول کیا، ایک مجلس کی تشکیل کی جس کی صدارت راجہ پیر برہو دی گئی، حکیم ہمام، شمشیر خاں اور قاسم علی خاں اس کے ارکان بنائے گئے، اس مجلس کو ہدایت تھی کہ مظلوموں کے معاملات کی تفتیش میں کوئی رورعایت نہ کی جائے، ظالم اور بے انصاف حکام کے خلاف جو بھی شکایتیں ہوں ان کو پوری توجہ سے سنا جائے۔ (اکبر نامہ ج ۳ ص ۴۰۵ مغلوں کی صوبائی حکومت از ڈاکٹر بی سرن باب قانون عدل، پولس ص ۳۷۷)

اکبر کے تینتیسویں سال جلوس وہ یوسف زئی قبیلہ کی سرکوبی کے لیے میوات کے

ہستانی علاقہ میں بھیجا گیا، مگر وہاں اس مہم میں ایسا ہلاک ہوا کہ اس کی لاش کا پتہ نہ چل سکا، اکبر کو اس کی موت کی خبر ملی تو دو روز تک کچھ کھایا پیا نہیں اور نہایت حسرت سے کہتا تھا کہ اس کی لاش کھاٹ سے لائی جاتی تو اس کو چتا نصیب ہوتی مگر یہ کہہ کر اپنے کوسلی دیتا کہ وہ وارستہ مزاج تھا، اس لیے پابندیوں سے آزاد رہا اس کو پاک کرنے کے لیے نیر اعظم کی تمازت کافی ہے ویسے اس کو پاکی کی ضرورت نہ تھی۔ (ماثر الامراج ۲ ص ۱۲۱، منتخب التواریخ ص ۱۶۱-۳۵۱) اکبر نے اس کی موت پر ہندی میں یہ غمناک شعر بھی کہا تھا:

دین دیکھی سب دین ایک نہ دینو دوسہ دکھ سو ہم اب کہو ادب دیں کچھ نہیں را کھیو بیر  
ایک ہندی شاعر کے ساتھ غفو و درگذر: اکبر کے دربار میں ایک ہندی شاعر سورج  
داس امین کے عہدے پر مامور تھا، ایک موقع پر اس نے سادھوؤں کی تواضع اور دعوت میں  
شاہی خزانہ سے تیرہ لاکھ دام خرچ کر دیے اور حسب ذیل شعر لکھ کر روپوش ہو گیا:

تیرہ لاکھ سنڈیلے آئے سب سادھوؤں میگی لنگے سورج داس مند موہن کو لی لراتی ادھی ہی سکے  
اکبر کو یہ معلوم ہوا تو سورج داس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ (مڈیول انڈیا  
کو ارٹری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

راجپوتوں کو عہدے دینے میں فیاضی: اکبر نے اپنی حکومت کے زمانہ میں راجپوتوں کو  
بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا، عہدوں کے دینے میں وہ ہندو مسلمان کا امتیاز نہ کرتا جس  
کو جس عہدہ کے لائق سمجھتا اس کو بلاتا مل عطا کر دیتا، بعض راجپوت منصب داروں کا ذکر ہم  
ذیل میں مختصر طریقہ پر بیان کرتے ہیں:

(۱) راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹا راجہ جو دھ پور کے راجہ مال دیو کا بیٹا تھا، ۹۹۲ھ  
میں اپنی بیٹی مان ستی عرف جگت گسائین کی شادی شہزادہ سلیم سے کی جس کے بعد وہ منصب  
ہزاری پر سرفراز ہوا اور اپنے وطن کی حکومت بھی بطور جاگیر پائی، ۲۳ جلوس اکبری میں صادق خان  
کے ساتھ رہ کر بندیلہ کی تنبیہ کے لیے متعین ہوا، ۲۵ جلوس میں گجرات اور ۳۸ جلوس میں سروہی



کی مہم پر بھیجا گیا، چار ہزاری منصب تک پہنچا۔ (ماثر الامراء، ج ۳ ص ۱۸۱)

(۲) راجہ بہار اہل کچھواہا انبیر کا راجہ تھا، اکبر نے اس کو پنج ہزاری منصب پر سرفراز کیا جو اس عہد کا سب سے بڑا منصب تھا اس کی بیٹی اکبر کے حرم میں داخل ہوئی وہ اپنی آخری عمر تک اعلیٰ خدمتوں پر مامور ہوتا رہا جب اکبر نے ۹۷۹ھ میں ابراہیم حسین مرزا کے خلاف گجرات کی طرف لشکر کشی کی تو راجہ کو وکیل مطلق بنا کر فتح پور سکری چھوڑا، اس کے بھائی اور بھتیجے بھی اکبر کے الطاف و اکرام سے برابر نوازے گئے۔ (ماثر الامراء، ج ۲، ص ۱۱۱)

(۳) راجہ سکرن کچھواہا، راجہ بہار اہل کچھواہا کا بیٹا اور راجہ بھگوان داس کا چھوٹا بھائی تھا، اس کے ساتھ اکبر کی ملازمت میں داخل ہوا، ۲۳ جلوس میں صادق خاں کے ساتھ راجہ مدھ کر بندیلے کی تنبیہ پر مامور ہوا، راجہ ٹوڈرل کے ساتھ بہار میں بھی رہا، ۳۰ جلوس میں منصب ہزاری پا کر دکن کی مہم پر گیا، ۳۱ جلوس میں اکبر آباد کا صوبے دار مقرر ہوا، ۳۳ جلوس میں راجہ مدھ کر کی تنبیہ پر روانہ ہوا، اسی سال وفات پائی، ۳۰ ہزاری منصب تک پہنچا تھا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۷۱ طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۴۱)

(۴) رائے رایان راجہ بکر ماجیت پندر داس (پتمبر داس) قوم کا کھتری تھا، شروع میں اکبر کے فیمل خانہ کا مشرف ہوا، کچھ دنوں کے بعد رائے رایان کے خطاب سے نوازا گیا، ۲۴ جلوس میں صوبہ بنگالہ کا دیوان مقرر کیا گیا، ۳۱ جلوس میں بہار کا دیوان بنا کر بھیجا گیا، ۳۸ جلوس میں قلعہ باندھو کی تسخیر کے لیے مامور ہوا، ۴۳ جلوس میں دیوان کل کے عہدہ پر فائز کیا گیا، ۴۶ جلوس میں منصب سہ ہزاری پایا اور گوالیار کا فوجدار مقرر ہوا، ۴۹ جلوس میں منصب پنج ہزاری ملا جس سے بڑھ کر کوئی اور منصب نہ تھا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۳۹)

(۵) جگمل کچھواہہ، راجہ بہار اہل کچھوٹا بھائی تھا، منصب ہزاری پر پہنچا تھا

کہ وفات پا گیا۔ (ماثر الامراء، ج ۱ ص ۵۱)

راجہ روپ سی راجہ بہار اہل کچھوٹا بھائی تھا، چھٹے سال جلوس میں اکبر کے دربار میں

حاضر ہو کر شاہانہ اکرام سے نوازا گیا، بیسویں سال جلوس میں مرزا سلیمان حج کے لیے روانہ ہوا تو اس کا راہبر مقرر ہوا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(۶) راجہ جے مل کچھواہہ راجہ روپ سی کچھواہہ کا بیٹا اور راجہ بہار ایل کا بھتیجا تھا،

۱۸۔ ۱۷ جلوس اکبری میں گجرات کی مہم پر شاہی لشکر کے ساتھ تھا، ۲۱ جلوس میں دو واپس سرجن

کی تنبیہ کے واسطے لوندی بھیجا گیا، ۹۹۱ھ میں وفات پا گیا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۱۰-۱۰۹)

(۷) کنور جگت سنگھ کچھواہہ راجہ مان سنگھ کا بڑا بیٹا تھا اس پر اکبری خاص عنایت

تھی، ۲۲ جلوس میں آصف خاں کے ساتھ راجہ باسو کی تنبیہ پر مامور ہوا، عین جوانی میں

وفات پا گیا جس سے اکبر کو بڑا دکھ ہوا اس کی ایک لڑکی جہانگیر کی حرم میں داخل ہوئی جس کی

شادی میں مہاراجہ مان سنگھ نے لاکھوں روپے جہیز دیے۔ (ماثر الامراء، ج ۳ ص ۱۳۹)

(۸) درگا داس سیسبویہ چند راوت کا رہنے والا تھا، چھوڑ کے رانا اودے سنگھ کی

ملازمت چھوڑ کر اکبر کے دربار میں آیا اور امرا خاص میں داخل ہو گیا ۲۶ جلوس میں شہزادہ

مراد کے ساتھ مرزا محمد حکیم کے خلاف لشکر کشی کی پھر ۳۰ جلوس میں خاں اعظم کے ساتھ دکن

کی مہم پر گیا ۳۶ جلوس میں شہزادہ مراد کے ساتھ مالوہ میں تعینات ہوا، ۴۵ جلوس میں مرزا

مظفر حسین کے خلاف بھیجا گیا جس کو اس نے بادشاہ کے حضور میں لا کر پیش کیا اسی سال

ناسک کی مہم میں شریک ہو کر بڑے جنگی کارنامے انجام دیے، چالیس سال سے زیادہ عرصہ

تک اکبری خدمت کرتا رہا چار ہزاری منصب تک پہنچا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۴۱)

(۹) راجہ رام چوہان بدن سنگھ چوہان کا بیٹا تھا، اٹھارہویں سال جلوس میں اکبر کے

ساتھ گجرات کی مہم میں تھا، چھبیسویں سال جلوس میں شہزادہ مراد کے ساتھ مرزا محمد حکیم کی تنبیہ

کے لیے بھیجا گیا، اڑتیسویں سال جلوس میں برار شاہی خزانہ کی ایک لاکھ اشرفیاں بحفاظت

تمام لانے کے لیے روانہ کیا گیا، مرزا شاہ رخ کے ساتھ صبح مالوہ میں متعین ہوا پھر دکن کی مہمات

میں شریک ہوا، ۱۰۰۵ میں سہیل خاں عادل کے سپہ سالار کے خلاف جنگ کرتا ہوا زخمی ہوا جس

کے بعد اکتالیسویں سال جلوس میں وفات پا گیا۔ (ماثر الامراء ج ۲ ص ۱۳۸)

(۱۰) راجہ رام داس کچھواہہ وطن لوئی تھا، معمولی خاندان سے تھا لیکن اپنی ذاتی صلاحیت کی بنا پر دربار سے واسطہ ہو کر اکبر کے مزاج میں بڑا درخور حاصل کیا، ۱۸ جلوس میں راجہ نوڈرل پٹنہ کی مہم پر روانہ ہوا تو رام داس کچھواہہ کو دیوانی کا خلعت عطا کر کے دفتر شاہی کے تمام کام سپرد کیے گئے، آہستہ آہستہ اکبر کے مزاج میں بڑا دخیل ہو گیا تھا جو اس کو اپنی جاں نثاروں میں سمجھتا تھا اس کی کسی بات کو رد نہ کرتا تھا، آگرہ کے قلعہ میں ہتیا پل کے نزدیک اس نے اپنی ایک حویلی بنائی تھی جب اکبر حرم سے سر میں جاتا تو دو سو نیزہ باز راجپوتوں کے ساتھ دروازہ پر موجود رہتا اس نے بڑی دولت جمع کر لی تھی، بڑی دریادلی کے ساتھ انعام و اکرام دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ جو انعام دیتا تھا لوگ ہر سال اسی مہینہ میں آ کر وصول کر لیا کرتے تھے، ایک با فروش نے اس کے لیے ہندی میں یہ کہا:

کہاں یوں بخان کروں اودات رام داس ہری دیبی مال کون جمال ہیریت میں  
(یعنی تمہاری تعریف اے اودات رام داس کے بیٹے کہاں تک کروں تمہاری بخشش کو لینے  
کے لیے ایک جمال چاہیے)

چوسر بازی کا بڑا شوقین تھا دو دن رات تک اس کھیل میں مشغول رہتا ہا رجاتا  
تو بے تکلف اپنے دوستوں کو گالیاں دیتا چاہے وہ بڑے مسلمان منصب دار کیوں  
نہ ہوتے، اکبر کی آخری علالت کے زمانہ میں شہزادہ سلیم کے ساتھ رہا، سرکاری  
خزانہ پر اپنے آدمیوں کو مقرر کر دیا کہ مخالفین کا قبضہ نہ ہو، جہانگیری دور میں اس  
کو بڑا اعزاز حاصل ہوا، راجہ کرن کا خطاب، نقارہ اوررن تھنور کا قلعہ مرحمت  
ہوا۔ (تذکرۃ الخوانین ص ۲۳۱-۲۳۸، مآثر الامراء ج ۲ ص ۱۵۵-۱۵۴)

(۱۱) رائے سنگھ بیکانیری بیکانیر کے راجہ رائے کلیان مل راٹھور کا بیٹا تھا، ۱۵ جلوس  
اکبری میں باپ کے ساتھ شاہی ملازمت سے منسلک ہوا، اس کے باپ کلیان مل نے اپنی

بھتیجی کو اکبر کی زوجیت میں دے کر خصوصیت حاصل کی، رائے سنگھ ۱۸ جلوس میں گجرات ۱۹ جلوس میں سوانا، ۲۱ جلوس میں سردہی اور جالور، ۲۶ میں پنجاب ۳۰ میں بلوچستان، ۳۶ میں ٹھٹھ، ۴۵ رناسک، ۴۸ میں شہزادہ سلیم کے ساتھ رانا کے خلاف چتوڑ کی مہم میں شریک ہوا، منصب چار ہزاری کا خطاب ملا، ۳۱ جلوس میں اس کی ایک لڑکی کی شادی شہزادہ سلیم سے ہوئی جو بیکانیری بیگم کہلاتی تھی، جہانگیر نے اس کو اپنے عہد میں منصب پنج ہزاری سے سر بلند کیا۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۴۸)

(۱۲) راجہ سرجن ہاڈا اودے پور کے رانا اودے سنگھ کا عزیز تھا، اس کی طرف سے رن تھنپور کے قلعہ کا حاکم تھا، ۱۳ جلوس میں اکبر نے اس قلعہ پر حملہ کیا تو کچھ دنوں مدافعت کے بعد رائے سرجن نے اس کو اکبر کے سپرد کر دیا، اس کے بعد اکبر نے اس کو منصب دو ہزاری پر سرفراز کر کے گڑھ کی جاگیر عطا کی پھر ۲۰ جلوس میں گڈھ کے بجائے چنادہ کی جاگیر مرحمت کی اور بوندی کو فتح کرنے میں وہ معاون ہوا جس کے بعد اس کو دو ہزاری منصب ملا۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۱۵-۱۱۳)

(۱۳) رائے کلیان مل بیکانیری بیکانیر کے راجہ اور رائٹھور خاندان کا تھا، ۱۵ میں شاہی ملازمت میں داخل ہو کر منصب دو ہزاری ذات دو ہزار سوار سے سر بلند ہوا، اس کی ایک بھتیجی کی شادی اکبر سے ہوئی۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۴۸)

(۱۴) رائے لون کرن کچھواہہ سانہر کا زمیندار تھا، شاہی ملازمت میں داخل ہو کر اکبر کا منظور نظر ہو گیا اور رائے کے خطاب سے سر بلند کیا گیا، ۲۱ جلوس میں کنور مان سنگھ کے ساتھ رانا اودے پور کے خلاف چتوڑ کی مہم پر گیا، اسی سال راجہ پیر بر کے ساتھ ڈونگر پور بھیجا گیا، جہاں کاراجہ اپنی لڑکی کو شاہی محل میں داخل کرنا چاہتا تھا، ۲۴ جلوس راجہ ٹوڈرل کے ساتھ مہم بنگالہ اور ۲۸ جلوس میں عبدالرحیم خانخاناں کے ساتھ مہم گجرات میں شریک رہا، اس کا لڑکاراے منوہر داس اکبر کو بہت عزیز تھا اس نے اس کی تربیت کی اور انبیر کے پاس شہر

منوہرنگر کے نام سے آباد کیا اور اس کو رائے لون کرن کچھواہہ کی جاگیریں دیں، رائے منوہر داس سلطان مظفر حسین مرزا گجراتی کے خلاف ایک مہم میں بھیجا گیا۔

(مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۱۶-۱۱۵)

(۱۵) مادھوسنگ کچھواہہ راجہ بھگوان داس کا چھوٹا بیٹا تھا اکبر کے ساتھ احمد نگر اور بنگالہ کی مہم پر گیا مان سنگھ کی معیت میں چتوڑ کی مہم میں رانا اودے سنگھ کے خلاف لشکر کشی کی، مرزا حکیم سرکوبی کے لیے بھی کابل کی مہم میں شریک تھا، ۲۸ جلوس میں منصب سے ہزاری ذات دو ہزار سوار سے سرفراز کیا گیا۔ (مآثر الامراء، ج ۳ ص ۳۲۱)

(۱۶) راجہ مہا سنگھ کچھواہہ راجہ جگت سنگھ کا بیٹا اور راجہ مان سنگھ کا پوتا تھا، اس کی ایک بہن کی شادی جہانگیر سے ہوئی تھی، اکبر نے راجہ جگت سنگھ کے مرنے کے بعد راجہ مہا سنگھ کو بنگالہ کی حکومت پر سرفراز کیا اس کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر افغانوں نے بنگالہ میں شورش پیا کر دی لیکن وہ رفتہ رفتہ ان پر غالب آیا، ۵۰ جلوس اکبری میں منصب دو ہزاری سے سرفراز ہوا، جہانگیر کے زمانہ میں اس کا منصب چہار ہزاری ذات وسہ ہزار سوار ہو گیا تھا۔ (ترک جہانگیری لکھنؤ ایڈیشن ص ۱۶۱ مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۷۴)

اکبری عہد کے چھوٹے منصب داروں کے نام یہ ہیں:

بل بھدر سہ صدی، بالکا کچھواہہ چہار صدی، پرمانند کھتری پانصدی، پرتاب سنگھ دو صدی، تلسی داس جادون سہ صدی، جگمال پنواڑ پان صدی، رام چند کچھواہہ چہار صدی، سانوال داس جادون دو صدی، سلہدی چہار صدی، سانگھا پنواڑ دو صدی، سندردو صدی، کشن داس تو نوڑ سہ صدی، کلا کچھواہہ دو صدی، کیشو داس تو نوڑ دو صدی، راٹھوردو صدی، متھرا داس کھتری دو صدی، میدنی راؤ چوہان ہفت صدی، بابو منگل ہفت صدی، نیل کنٹھ سہ صدی وغیرہ۔

سنسکرت علوم کی ترویج: اکبر نے اپنی رواداری میں یہ کوشش بھی کی کہ سنسکرت کی

کلاسیکل کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوتا کہ مسلمان ان کو پڑھ کر ان کے علوم سے واقف ہوں، اس لیے اس نے سنسکرت کے ترجمے کی ایک باضابطہ مہم شروع کی، اس کے حکم سے نقیب خاں، ملا عبد القادر بدایونی، ملا شیریں، سلطان حاجی تھانیسری نے مل کر مہا بھارت کا فارسی ترجمہ ۹۹۵ھ میں کیا، اس کی خواہش پر اس کو مضمور بھی کیا گیا اور اس کا فارسی نام رزم نامہ رکھا گیا۔ (آئین اکبری ج ۱ ص ۶۷ منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۲۱-۳۱۹)

ملا عبد القادر بدایونی نے مسلسل چار سال کی محنت کے بعد راماین کا بھی فارسی ترجمہ ۹۹۶ء میں کیا، (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۶۶ آئین اکبری ج ۱ ص ۷۶) اتھرویدیا اتھرین کا فارسی ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا، (آئین اکبری ج ۱ ص ۷۶، منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۴) تاجک علم نجوم میں ایک مفید تصنیف ہے، مکمل خاں گجراتی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۷۶) ہرنس میں کرشن جی کی زندگی کے حالات ہیں، ملا شیریں نے اس کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا، (آئین اکبری ج ۱ ص ۷۶) ملا عبد القادر بدایونی نے سنسکرت کی مشہور کتاب سنگھاسن ہتی کے قصوں کو فارسی کا جامہ پہنایا اور اس کا تاریخی نام خرد افزار رکھا، انھوں نے ہندی افسانہ کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ بحر الاسما کے نام سے کیا، (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۱) کلہانا کی مشہور کتاب راج ترنگنی سلطان زین العابدین کے زمانہ میں سنسکرت میں لکھی گئی، اکبر کی فرمائش سے اس کا ترجمہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں کیا اور اس کا انتخاب ملا عبد القادر بدایونی نے سلیس زبان میں کیا، (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۷۴) سنسکرت کی مشہور کتاب پنج تنتر کا فارسی میں ترجمہ ملا حسین واعظ نے کلیلہ و دمنہ کے نام سے کیا تھا لیکن وہ ترجمہ اتنا مشکل تھا کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا، اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت سامنے رکھ کر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ اس کے پند و نصائح آسانی سے سمجھ میں آئیں، ۹۹۶ھ میں ابوالفضل نے اس کام کو انجام دیا اور اس کا نام عیار و دانش رکھا۔ (آئین اکبری ج ۱ ص ۷۷)

ابوالفضل کے بڑے بھائی فیضی نے سنسکرت میں حسام کی مشہور کتاب لیلاوتی کا ترجمہ فارسی میں کیا، (آئین اکبری ج ۱ ص ۷۷) فیضی نے نل دوسن کے قصہ کو بھی فارسی میں منظوم کیا، اکبر ہی کی فرمائش سے زیچ جدید مرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا، جس میں میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگادھر اور ہمیش مہانند شریک تھے۔

(آئین اکبری ج ۱ ص ۷۶)

اکبر کے دربار سے ہندو فضلا کی ایک کثیر جماعت منسلک رہی، ابوالفضل نے دانش اندوزان جاوید دولت کے سلسلہ میں خدیونشائین کی فہرست میں مادھوسرتی، مدھ سوون، ناراین اسرم، بہرجی سور، دامودر پرت، رام تیرتھ، نرسنگھ، بیرم اندر، ادت کے نام گنائیں ہیں پھر شناسائے عقلی کلام کی فہرست میں ناراین، مادھوبٹ، سری بھٹ بیشن ناتھ، رام بشن، بلبھدر مصر، باسدیومصر، بابن بھٹ، بدیانواس، گوری ناتھ، گوپنی ناتھ کشن پنڈت بھٹا چارج، بھاگیرت بھٹا چارج، کاشی ناتھ بھٹا چارج وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۶۶) مزید تفصیلات کے لیے دیکھو بزم تیموریہ ج ۱، از خاکسار مؤلف، ص ۵۸۲۔

سنسکرت کے شعرا میں اکبریہ کالی داس اور جگن ناتھ پنڈت راج اکبر کی شان میں مدحیہ نظمیں کہہ کر بڑے بڑے انعامات پاتے رہے۔ (رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۵۳ء)

ہندی شاعری کی سرپرستی: اکبر نے سکندر کے ساتھ ہندی زبان کی بھی سرپرستی کی، وہ خود ہندی زبان میں شاعری کرنے لگا تھا اور تخلص رائے کرن رکھتا تھا اس کی ہندی شاعری کے کچھ نمونے یہ ہیں:

تا کو چوں سہل ہے کہے اکبر ساہی

جا کو جس ہے جگت میں، جگت سرا ہے جاہی

آہٹ تین ابلا نرکھیو چکی چونکی چیلی کری آنر چالاہی

ساہی اکبر ایک سٹے چلے کانہ ونود بلوکن بالہی

چمیک چاروں کمان چڑھاوت کام جیون ہاتھ لیے رہی بالاہی

تیون بلی مینوسدھاری دھری سو بھئی چھپی یوں للنا اول ہی

(جس کی شہرت دنیا میں ہے اور جس کی تعریف سب لوگ کرتے ہیں صرف وہی کامیاب ہیں، اکبر شاہ کا یہی کہنا ہے یہی اس کا خلاصہ ہے۔

اکبر نے کنور مان سنگھ کو اپنے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کے خلاف ایک فوج لے کر بھیجا تو وہ اپنے مذہبی عذر کی بنا پر اٹک آ کر رک گیا اور اس سے آگے بڑھنے سے انکار کیا، اکبر اس وقت لاہور میں تھا، اس نے مان سنگھ کو یہ لکھ کر بھیجا:

سب سے بھولی گوپال کی یاد میں اٹک کہاں جا کے من میں اٹک ہے سوئی اٹک کہاں  
راجہ پیر بر کی موت پر اکبر نے جو ہندی شعر کہا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

راجہ پیر بر کے علاوہ جو ہندی شعر اکبر کے دربار سے وابستہ رہے ان میں سے بعض

کے نام یہ ہیں:

نرہری بندی جن چہل آسی ضلع فتح پور (یوپی) کا رہنے والا تھا، ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوا، اکبر نے اس کے شاعرانہ کمال سے متاثر ہو کر اس کو مہا پتر کا خطاب دیا اور یہ کہا کہ اور شعرا گن کے پتر ہیں، مگر نرہری مہا پتر ہے ایک بار اس کی ایک نظم پڑھ کر ایسا متاثر ہوا کہ اپنی مملکت میں گاؤ کشی بند کرادی۔

راجہ اسکرن کچھواہہ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اکبری دربار کا سہ ہزاری منصب دار

تھا، ہندی کا اچھا شاعر تھا۔

بلبھدر آچاریہ کیشو داس کا بڑا بھائی تھا، سنسکرت اور ہندی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، سنسکرت میں اس کی دو کتابیں بھگوت بھاشیا اور بلبھدر دیا کرن ہیں، ہندی میں بھی دو کتابیں لکھیں، دوش و چار اور نکھشیش، ابوالفضل نے اس کا ذکر بلبھدر برہمن کے نام سے کیا ہے، وہ مالوہ کے راجہ کے خلاف ایک مہم میں بھیجا گیا، محبوب کا سراپا کھینچنے میں اس کو بڑی مہارت تھی، بریکانیر کے راجہ کا بھائی بھی اکبر کے دربار سے وابستہ رہا، برج بھاشا کا اچھا شاعر تھا، اس کی تصانیف میں پریم پراد مپیکا بہت مشہور ہوئی۔



راجہ ٹوڈرل اور راجہ مان سنگھ بھی ہندی میں اشعار کہتے، راجہ مان سنگھ تو ہندی شعرا کا بھی بڑا سرپرست رہا، ایک موقع پر اس نے ایک دوہے پر ایک لاکھ روپے انعام میں دیے۔  
(ہسٹری آف ہندی لٹریچر از ایف۔ اے۔ کی)

دربار کے اور دوسرے ہندی شعرا میں رائے منوہر مول رائے جگن ناتھ، راجہ مکند سنگھ ہاڈا، گنگ، گنگ بھٹ اور تان سین تھے جو اکبر کے ساتھ رزم اور بزم دونوں میں شریک رہتے تھے۔

عبدالرحیم خانخانا نے بھی ہندی شاعری میں غیر معمولی مہارت حاصل کر لی تھی، اس کے دربار میں جس طرح فارسی شعرا میں عرفی، شکیبی، رسمی، نوعی، شیرازی، ثنائی، خراسانی، کفوی اور مغزی جیسے بلند پایہ شعرا اس کی زر پاشیوں سے سیراب ہوتے رہے، اسی طرح ہندی شعرا کیشو داس، گنگ، ہری ناتھ، ہول رائے اور مکند وغیرہ بھی اس کے یہاں سے بڑے بڑے صلے پاتے رہے جس طرح اس نے خوش ہو کر نوعی شیرازی کو سونے میں تلوادیا اور نظیری نیشاپوری کو اس کی درخواست پر ایک لاکھ روپے کا ڈھیر دکھا کر پوری رقم اس کے گھر بھیج وادی، اسی طرح اس نے گنگ کوی کو ایک بار چھتیس لاکھ روپے انعام میں دیے،  
(ہسٹری آف ہندی لٹریچر از ایف۔ اے۔ کی) (ماثر جمی میں ہے کہ اس نے جتنے انعامات فارسی شعرا کو دیے اتنے ہی ہندی شاعروں کو عطا کیے) (ماثر جمی ج ۲ ص ۵۶) جس طرح وہ فارسی کے اساتذہ کے مقابلہ میں غزلیں کہتا تھا اسی طرح ہندی کے شاعروں کے مقابلہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا اس نے اپنی زبان کی سادگی، خیالات کی بلندی، طرز بیان کے انوکھے پن، معنی آفرینی، حسن تعلیل، اخلاقی پسند و نصیحت کی وجہ سے اپنے ہم عصر شعرا میں گنگ، کیشو، سیناپتی، بہاری لال اور منی رام سے بھی داد حاصل کی، مآثر جمی کے مؤلف کا بیان ہے کہ اس نے ہندی زبان میں ید بیضا دکھایا اور اتنے متین اور دلنشین اشعار کہے کہ خود ہندی کے شاعروں نے نہ کہے ہوں گے (ماثر جمی، ج ۲ ص ۵۶۲) اس کے نام سے بہت

سی تصانیف منسوب ہیں، مثلاً دوہادلی، نگر شو بھا، بروے نایکہ بھید، بروے شمرنگار سورٹھا مدنا سنگ، پھنگرید اور رحیم کاویہ، ان میں سے بعض مجموعوں میں شری کشن اور رام چندر کی شان میں بہت سے اشعار ہیں، ہم نے اپنی کتاب بزم تیموریہ جلد اول میں ان پر بحث کی ہے اور شبہہ کا اظہار کیا ہے کہ کہیں ایسا نہیں کہ رحیم نام کا کوئی اور ہندو شاعر گزرا ہو جو کرشن بھگت اور رام بھگت بھی رہا ہو اور اس کے اشعار عبد الرحیم خانخاناں سے منسوب ہو گئے ہوں۔ (بزم تیموریہ ج ۱ ص ۸۲-۳۷۵)

ہندی شاعری کا زریں دور: اکبری دور میں ہندی شاعری کو بڑا عروج حاصل ہوا اسی دور میں ہری داس، سورداس، پدماننداس، کمبھن داس، ہند داس، چتر بھوج داس، چھیت سوامی اور گووند سوامی جیسے بھگت شعرا گذرے ہیں۔

سورداس سری بھاگوت کو ماخذ بنا کر اپنی منظوم تصنیف سورساگر کے نام سے لکھ کر زندہ جاوید ہو گئے ہیں، ان کی اور منظوم تصانیف کے نام سورسا راولی اور بہت لہری ہیں، ان کی سورساگر فارسی رسم الخط میں بھی لکھی گئی تھی، اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ سبحان اللہ کے مجموعہ میں ہیں، خود سورداس فارسی جانتے تھے ان کتابوں میں فارسی کے بھی الفاظ پائے جاتے ہیں، ابوالفضل نے آئینہ اکبری میں اکبری دربار کے ماہرین موسیقی میں سورداس کا نام بھی لکھا ہے۔ (آئینہ اکبری ج ۱ ص ۱۸۳)

اکبر کے دربار کا مشہور ماہر موسیقی تان سین سورداس کا بڑا معتقد تھا، سورداس کی تعریف میں کہتا ہے:

کدھو سور کے سر لگیو کدھو سور کے پیر کدھوں سور کے پد لگیوتن من ہوت سیر  
مجھ کو سور پر قربان ہونے دو اور کبھی اپنے اوپر ان کی تکلیف کو آنے دو، مجھ کو سور  
کے پاؤں کو چومنے دو تا کہ ان کے تن اور من کی آواز میرے بدن میں بھی پہنچ جائے۔  
سورداس نے بھی تان سین کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے:

بیدھی ناہبہ جیو جاتی ایشیش دیے نہ کان دھرا اہر سب ڈولتے تان سین کی تان  
سیراناگ زمین کو اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہے اس کے کان نہیں ہوتے لیکن یہ  
کیسے، تعجب کی بات ہے کہ جب تان سین گاتا ہے تو اس کی تان کوسن کر زمین اور آکاش بھی  
ہل جاتے ہیں، کرشن داس ذات کے شدر تھے لیکن بھگت ہو کر گوگل من چرتر اور ستوزوپ  
اور پھرا ماگرت لکھیں۔

پرمانند داس قنوجی برہمن تھے پرمانند ساگر پرمانند داس کے پداوردن لیلہ ان کی  
نظموں کے مجموعے ہیں، ان کی کچھ کبتائیں سکھوں کی مقدس کتاب گرنٹھ صاحب میں  
داخل کر لی گئی ہیں۔

کمبھن داس گودیہ برہمن تھے، تیاگ کی زندگی بسر کرتے تھے اکبر نے ان کو فتح  
پور سیکری بلا بھیجا اور ان کی سواری کے لیے ایک پاکی بھیجی لیکن پاکی پر سوار ہونا پسند نہیں کیا  
اور جب فتح پور سیکری اکبر کے پاس پہنچے تو اپنی آزر دگی کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

ستنن کو کیا سیکری سو کام آدت جات پنھیان ٹوٹی بسر گٹوہری نام  
جا کو دیکھے لاگے تا کو کرن پری پر نام کمبھن داس لال گردھر بن یہ سب جھوٹو دھام

(ایک سنت کو سیکری میں کیا کام ہو سکتا ہے، میرے آنے جانے میں میری  
کھڑاؤں ٹوٹی اور میں ہری کا نام بھول گیا اور ایک ایسے کو سلام کرنا پڑا جس کو دیکھ کر دکھ ہوتا  
ہے، کمبھن داس گردھر کے بغیر سارے گھر بے فائدہ ہیں)

ننداس گو سوامی تلسی داس کے بھائی تھے، سور داس کے بعد ان ہی کا درجہ تسلیم کیا  
جاتا ہے ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ان کے بارے میں کہا گیا ہے: اور کوی جڑیا، ننداس  
گڑھیا ہیں، یعنی اور دوسرے شعرا زیورات بناتے ہیں لیکن ننداس موتی جڑتے ہیں۔

چتر بھوج داس کمبھن داس کے لڑکے تھے، بڑے مشہور کرشن بھگت ہوئے ان کی  
نظموں کے مجموعے چتر بھیج کیرتن سنگرہ، کیرت ناولی اور وان لیلہ کے نام سے شائع ہوئے

ہیں۔ (ہندی سہتہ کا اتہاس از ڈاکٹر سکندر ص ۲۰۴)

چھت سوامی راجہ پیر بر کے پروہت بھی تھے، پداولی ان کے پدوں کا مجموعہ ہے (ایضاً ص ۲۰۳) گووند سوامی سندھیہ برہمن تھے، سوامی وٹھل ناتھ کی شاگردی کے بعد گووردھن میں آباد ہو گئے تھے، موسیقی سے بھی شغف کرتے ان کی نظموں کے مجموعہ کا نام گووند سوامی کا پد ہے۔ اس دور کے اور ہندی شعرا میں سوامی پنت نرنجن نروتم داس مصنف سوداما چتر، ایک ناتھ ہری ویاس جی، دہروداس، کرشن چندر جی، پیتمبر داس وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

اسی زمانہ میں دادو بھی گزرے ہیں جو احمد آباد میں ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰۲ء میں نماٹنا (جو دھپور) میں وفات پا گئے، وہ بھی کبیر داس کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملانے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے ہندی، مرواڑی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی میں ساکھیاں اور پد لکھے، ان کے کچھ اشعار فارسی میں بھی بتائے جاتے ہیں، اکبر نے ان کو اپنے یہاں بلا کر چالیس دن تک رکھا۔

اسی دور میں سکھوں کے مذہبی رہنما گردارجن سنگھ ہوئے جنھوں نے ۱۶۰۴ء میں گرنٹھ صاحب کی تدوین کی اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے پیشواؤں کے بھی اقوال ہیں۔ گو سوامی تلسی داس کا بھی یہی زمانہ رہا، وہ ۱۵۳۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۲۳ء میں فوت ہوئے، اس طرح انھوں نے جہانگیر کا زمانہ بھی پایا ان کی کتاب رام چتر یعنی راماین کو جو شہرت ہوئی کسی اور کتاب کو کم ہوئی ہوگی۔

ہندی کے مسلمان شعرا: اس دور میں ہندی کے مسلمان شعرا نے بھی کافی شہرت حاصل کی، رسکھان کو دو تصنیفیں پریم بانکا اور سچان رسکھان بہت مشہور ہوئیں، کہا جاتا ہے کہ برج بھاشا کے پورے دور میں عشق کی سرمستی جتنی رسکھان کی شاعری میں ہے کسی اور کے یہاں نہیں ملتی، (ہسٹری آف ہندی لٹریچر از۔ ایف۔ اے۔ کی) تان سین فن موسیقی میں یگانہ روزگار ہونے کے علاوہ ہندی کا شاعر بھی تھا، اس کو دو تصانیف سنگیت سار اور راگ مالا بتائی جاتی ہیں،

اس دور میں شیخ دانیال چشتی کی وفات ۱۵۸۵ء میں ایک سو گیارہ سال کی عمر میں ہوئی، وہ بھی ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے (پنجاب میں اردو از محمود شیرانی، ص ۱۱۶) اس عہد کے دو اور شاعر قادر (ولادت ۱۵۱۸ء) اور مبارک علی بلگرامی (ولادت ۱۵۸۳ء) قابل ذکر ہیں، قادر پہیانی ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے، ان کے اشعار آج بھی عوام میں مشہور ہیں، مبارک نے محبوبہ کے دس مختلف اعضا پر سو سو دوہے لکھے، ہندی میں ان کی دو کتابیں الک شنک اور تل شنک شائع ہو چکی ہیں۔ (ہندی شاعری از اعظم کر یوی ص ۷۹)

اکبر کا بیٹا شہزادہ سلطان دانیال بھی ہندی کا شاعر تھا، جہانگیر اس کے متعلق تزک میں لکھتا ہے کہ اسے ہندی سے دلچسپی رہی اور ہندی میں شعر کہتا تھا جو برے نہیں ہوتے تھے۔ (تزک جہانگیری ص ۷۱ انول کشور پریس ایڈیشن)

اسی عہد میں شیخ شاہ محمد فرملی بھی ہندی کے مشہور شاعر گذرے ہیں، ان کی محبوبہ چمپا تھی، جس کے سوال اور جواب کو انھوں نے بہت ہی دلکش طریقہ سے منظوم کیا ہے۔  
(ماثر الکرام از آزاد بلگرامی ج ۲ ص ۵۶-۳۵۲)

فنون لطیفہ میں رواداری: اس دور کے آتے آتے فنون لطیفہ کے اور دوسرے اصناف میں بھی بڑی رواداری کا اظہار ہوتا رہا، مسلمان ہندوستان آئے تو ایران اور عرب کی راگ راگنیاں مثلاً عشاق، بوسلیک، یانوا، اصفہان، بزرگ، کوچک، عراق، حسینی، زنگولہ، رہوائے، حجاز، مبارکہ، کرشمہ، بیعت، نیشاپوری، قول، قلبانہ، ترانہ وغیرہ ساتھ لائے، امیر خسرو نے ان راگ راگنیوں کو ہندوستانی راگ راگنیوں سے ملانے کی کوشش کی پھر جون پور کے حکمراں حسین شاہ شرقی (۱۲۸۳ء-۱۳۵۷ء) تو ہندوستانی راگ راگنیوں کا ایسا رسیا ہوا کہ اس نے خود ہندوستانی راگ راگنیوں کی ملا کر ایک درجن سیام اور چار ٹوریاں ایجاد کیں اور نام بھی خالص ہندوستانی رکھے، مثلاً ملہار سیام، گوراسیام، بھوپال سیام، کنیر سیام، سوہوسیام، دیگھ سیام، بسنت سیام، برآری سیام، سیام گودانی، گوندسیام، پوربی سیام، جونپوری ٹوڑی،

راما ٹوڑی، رسوتی ٹوڑی، پہلے ٹوڑی، گوالیار کے راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک بہت بڑا ماہر موسیقی ناک۔ بخشتو تھا، اس نے ہندوستانی راگ کلیان اور کانٹرا میں ترمیم کر کے جو راگ ایجاد کیے ان کے نام ناگی، کلیان اور ناگی کانٹرا رکھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو راگ درپن قلمی نسخہ دار المصنفین و ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے از خاکسار مؤلف، باب موسیقی)

ابوالفضل نے آئین اکبری میں سنگیت کے عنوان سے ہندوستانی سروں کی جو قسمیں لکھی ہیں وہ یہ ہیں کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنجم، دھیوت، نکھار، اسی طرح ہندوستانی راگ کی قسموں میں سری راگ، بسنت یا مالکوس، بھیرون، پنجم، میگھ، نٹ نرائن کی تفصیلات لکھی ہیں، راگ کے نام سارنگ، پوربی، دھتاسری، رام کلی، کرائی، سوہو، ویسکال اور ویساک بتائے ہیں، الاپ کی دو قسمیں ہیں راگ الاپ اور روپ الاپ لکھی ہیں پھرتان کی قسموں میں میدنی، رندنی، دینی، بھاونی اور تاراولی کا ذکر کیا ہے، اکبری دور کے آتے آتے ان تمام قسموں کو مسلمان ماہرین موسیقی نے اختیار کر لیا تھا ابوالفضل نے ہندوستانی باجوں میں سے جنتر بین، کنز، سر بین، انہرتی، سر منڈل، سارنگی، پناک، اوہٹی، کنگرہ، پکھاوج وغیرہ کی تفصیل لکھی ہے جو مسلمان سازندہ کے یہاں رائج ہوتے جا رہے تھے۔

مصوری میں رواداری: اکبری دور میں مصوری کو بھی بڑا فروغ ہوا، اس عہد میں اس فن کی رنگ آمیزی، صفائی، لطافت، تازگی، نزاکت اور ہاتھ کی مہارت کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جو فنون لطیفہ کی تاریخ کا ایک روشن باب بن گیا ہے، اکبر دربار میں اس فن کا درجہ کمال تک پہنچانے میں جہاں سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیرازی، محمد شریف شیریں راقم، احمد کشمیری، جمشید، جمال، دولت، دولت خان زاد حسین، فرخ چیلہ، فرخ قلمان، مسکین اور منصور وغیرہ کے وہاں وسونت، بساون، کیسو، لعل، کمند، مادھو، جگن، ہمیش، بھیم کرن، تارا، سانولا، ہرنس، رام، باس، بھوانی، دھانو، نایک سر جو، نرائن، امنت، اسی، کہار، گووند، جگناتھ تلسی، دھن راج،

دھرم داس، نندکلاں، نندکٹور، نرسنگھ، پیانگ، پارس، پریم، فتو، بنواری خورد، بھگوان، بھاگ،  
 بھیم گجراتی، بھورہ، منگر، پچھمن، لنگا، شیوداس، شنکر، سرون، سورداس وغیرہ بھی تھے، تاریخوں  
 میں جو نام نظروں سے گذرتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہی دربار میں ہندوں  
 مصوروں کی تعداد زیادہ تھی، ابوالفضل نے ان میں سے بعض ماہروں کی بڑی تعریف لکھی  
 ہے، مثلاً وسونت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خواہ عبدالصمد کی نگرانی میں تھوڑی ہی مدت میں  
 سرآمد روزگار ہو گیا اور بڑے بڑے کارنامے یادگار کے طور پر چھوڑے، بسا اوت کے متعلق  
 رقم طراز ہے کہ طراچی، چہرہ کتابی، رنگ آمیزی، مانند نگاری اور فن کی دوسری صنعتوں میں  
 یگانہ روزگار تھا، بعض ماہرین فن اس کو وسونت پر ترجیح دیتے ہیں (آئین اکبری جلد ۱ ص ۷۸  
 - ۷۷) مسلمان اور ہندو مصوروں کے ملے جلے کمالات سے مصوری کا وہ آرٹ پیدا ہوا جو  
 مغل آرٹ کہلایا، اجنتا کی نقاشی، رنگوں کی تیاری، روشنی اور سایہ کا خیال، فاصلہ کا احساس  
 اور طول و عرض میں جو کمال دکھایا گیا ہے اس سے مسلمان ماہرین مصورین ضرور متاثر ہوئے۔  
 (مزید تفصیل کے لیے دیکھو خاکسار مرتب کی کتاب ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے  
 عہد کے تمدنی جلوے، باب مصوری)

محللات کے اندر دیواروں پر جو مصوری کی جاتی اس سے بھی رواداری کا اندازہ  
 کیا جاسکتا ہے، مریم الزمانی، بیگم یعنی جہانگیر کی ماں سنہرے محل کے اندر جہاں طرح طرح  
 کے نقش و نگار تھے وہاں مصوری کے نمونے بھی تھے جن میں اس کی دیوار پر رام اور ہنومان جی  
 کی تصویریں بھی تھیں (کلرڈیکوریشن ان مغل آرکیٹیکچر از آرناتھ، ص ۵۵) اکبر نے جب  
 رامین اور مہا بھارت کے ترجمے فارسی میں کرائے تو ان دونوں کو مصور بھی کرایا اس سے نہ  
 صرف ہندوؤں کی دلداری یاد دل جوئی ہوئی بلکہ مسلمانوں کو یہ ترغیب دلائی گئی کہ یہ کتابیں وہ  
 بھی شوق سے پڑھیں۔

دین الہی: اکبر نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جو طرح طرح کی رواداریاں دکھائیں

وہ ایک مؤرخ کی نظر میں بہت ہی قابل فخر ہیں، ایسا حکمراں کسی بھی قوم کے لیے مایہ ناز سمجھا جاسکتا ہے مگر اس کی ذات اس کے جاری کردہ مذہب سے مجروح ہو کر رہ گئی ہے جو دین الہی کے نام سے مشہور ہے، معاصر تاریخوں میں ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ اور ابوالفضل کے اکبرنامہ کے ذریعہ ہی سے اس مذہب کو اب تک سمجھا گیا ہے، ملا عبد القادر بدایونی اکبر کے مذہبی رجحانات اور بدعات کے سخت مخالف رہے، اس لیے انہوں نے تو اس مذہب کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں مگر ابوالفضل دین الہی کا بڑا علمبردار تھا وہ چاہتا تو دین الہی کے فضائل میں اپنی قلم کی صاحبزانی ایسی دکھا سکتا تھا کہ ملا عبد القادر نے اس مذہب کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ دب کر رہ جاتا، ابوالفضل ہی کے بیانات قابل قبول سمجھے جاتے مگر ابوالفضل اس مذہب کی تفصیلات بیان کرنے میں بظاہر خود ہی مجبور معلوم ہوتا ہے اس کے قلم کی ساری شہ زوری ملا عبد القادر بدایونی کی تحریروں کے مقابلہ میں مدہم پڑ گئی ہے یہاں ہم پہلے ملا عبد القادر بدایونی کے بیانات کا خلاصہ پیش کریں گے جو بقول ان کے اکبر کی بے دینی اور بد اعتقادی اور اس نئے مذہب کے متعلق لکھا ہے پھر ابوالفضل نے اس مذہب پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی پیش کیا جائے گا۔

دین الہی اور ملا بدایونی: ملا عبد القادر بدایونی کی تحریروں کا خلاصہ یہ ہے:

بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانہ میں علما اور مشائخ کے ساتھ گذرتے، خاص طور سے جمعہ کی راتیں، شب بیداری، مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثوں میں گذرتی تھیں، علما کی زبانیں تلواروں کی طرح چلتی تھیں، مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جانے لگی، سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہ اور حکیم کے موازنہ مقابلہ سے ہٹ کر اصول دین پر بحث ہونے لگی، (ج ۲ ص ۲۵۵) درباری علما ایک دوسرے کو گمراہ اور خبیثی کہنے لگے علما کے ان اختلافات اور شبہات سے فائدہ اہل بدعت نے اٹھایا، انہوں نے باطل کو حق اور خطا کو صواب بتانا شروع کیا، بادشاہ اپنے اچھے جوہر کی وجہ سے



طالب حق تھا لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اس کو طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے گئے جن سے وہ عالم حیرت میں پڑ گیا اور اصل دین سے پھر گیا جس کے بعد پانچ چھ سال کے اندر اسلام کا سارا اثر جاتا رہا اور سارا معاملہ الٹ کر رہ گیا۔

(ج ۲ ص ۲۵۵)

دربار میں ہر دیا اور ہر مذہب کے دانا جمع ہوتے اور بادشاہ سے ہمزبانی کا شرف حاصل کرتے رہے، انھوں نے رات دن اس تحقیق و تفتیش کو اپنا شیوہ اور پیشہ بنا لیا، اس کے علاوہ وہ کوئی اور کام نہ کرتے وہ عجیب و غریب باتیں کرتے ایسی ایسی تاریخی و مذہبی تحقیقات پیش کرتے کہ ان کے مختصر طریقہ پر بیان کرنے میں بھی دفاتر کی ضرورت ہے (ج ۲ ص ۲۵۶) بادشاہ کو جو چیز پسند آ جاتی اس کا انتخاب کر لیتا لیکن اس کو وہ چیز پسند نہ آتی جو مسلمانوں کی ہوتی جو چیز اس کی مرضی کے خلاف ہوتی اس سے وہ احتراز اور اجتناب کرتا، بچپن سے عنفوان شباب اور پھر عنفوان شباب سے انحطاط عمر تک اس کی حالت کچھ ایسی رہی کہ اس نے مختلف قسم کے مذاہب کے معاملات اور اعتقادات سے معلومات حاصل کیں اور ایک جداگانہ علم کا مالک بن گیا اور اس کے ضمیر میں ایک عجیب قسم کا اعتقاد پیدا ہو گیا اس کے دل میں یہ خیال پتھر کی لکیر بن گیا کہ اصحاب عقل تمام مذاہب میں ہوتے ہیں، ہر قوم میں عبادت، کشف و کرامت کے لوگ ہیں، اس لیے حق کو ایسے دین اور ایسی ملت میں محدود کر دینا ضروری نہیں جو نسبتاً نیا ہو اور اس کی مدت کو ایک ہزار برس سے زیادہ نہ گزرے ہوں، ایک دین کا اقرار اور دوسرے کا انکار یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مناسب نہیں بادشاہ کے ان خیالات کو سمیٹ لیا یعنی بودھ مذہب کے عالموں اور برہمنوں نے زیادہ تقویت پہنچائی، انھوں نے شرف ملازمت حاصل کیا، وہ اپنے رسمی اور حقیقی علوم میں اور دوسروں سے بہتر تھے، اس لیے انھوں نے اپنے عقلی و نقلی دلائل سے اپنے دین کی سچائی ظاہر کی اور دوسروں کے مذہب کو باطل قرار دیا اور اپنے نظریات کے بدیہیات کو اس طرح ثابت کر دیا کہ کوئی ان

کو رد نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ حشر و نشر اور حدیث نبویؐ کی ساری باتوں کو کنارے لگا دیا اور دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین کی متنازع فیہ باتوں کو چن چن کر پیش کیا اور اپنے مذہب کی طرف بادشاہ کو ترغیب دی۔ (ج ۲ ص ۵۷-۲۵۶)

پر کھوتم نیامی برہمن کو بادشاہ نے اپنے پاس خلوت میں بلایا اور اس سے موجودات اشیاء کے نام ہندی میں معلوم کیے، اس کے بعد دیوی برہمن کو اپنے پاس بلایا اس کی چارپائی رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکہ کے برابر لگا دی جاتی اور وہ رات کو اس طرح معلق ہو کر ہندو مذہب کی پراسرار باتیں، افسانے، بتوں کی پوجا، آگ اور آفتاب کی پرستش اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتاتا، برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی کی عظمت کی دلیلیں پیش کرتا جن میں سے ہندو بعض کو خدا اور بعض کو فرشتہ سمجھتے ہیں ان کی باتیں بادشاہ کے دل میں اتر گئیں اور وہ عقیدہ تناخ کا قائل ہو گیا خوشامدی کلمہ گو درباری تناخ کے اثبات و صحت میں رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے لگے، بادشاہ ہندوؤں کے مذہب کی تحقیق کی طرف بہت زیادہ مائل ہو گیا گو ہندوؤں کے بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز ظاہر ہونے لگے، انھی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجدھنی دہلوی کی رسائی بادشاہ کے یہاں ہو گئی، وہ شیخ زمان پانی پتی کے شاگرد اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں شرح لوائح کافی مشہور ہے، نزہۃ الارواح کی بھی انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے وہ شیخ ابن عربی ثانی سمجھے جاتے تھے وہ بھی رات کو معلق چارپائی پر اوپر جا کر رات بھر اہل تصوف کے شطیحات اور اعتقادات سنایا کرتے تھے وہ شریعت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے مگر وہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کے قائل تھے، جس سے صرف اباحت اور الحاد پیدا ہوتا ہے انھوں نے فرعون لعنہ اللہ کے ایمان کو سمجھایا جو فصوص الحکم میں درج ہے، ترجیح رجا بر خوف اور اسی طرح کے اور مسائل بادشاہ کے ذہن نشین کیے جو عقل اور شریعت کے خلاف تھے بادشاہ کے ذہن

میں شریعت سے بیزاری پیدا ہوگئی جس کے بعد اس کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ کفار دوزخ کی آگ میں تو ضرور ڈالے جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں ہوگا، شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کی تاویل نص قرآنی اور حدیث نبوی سے کی، شیخ نے بادشاہ کے سامنے انسان کامل کا تصور پیش کیا اور اس کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود بادشاہ کی ذات اقدس کو اس کا اہل قرار دیا اور یہ بتایا کہ انسان کامل کے بعد درجہ صرف عین واجب یعنی ذات خداوندی کا ہے، اس سلسلہ میں بہت سی خرافات بتائیں، بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام زمین بوسی رکھا گیا بادشاہ کے ادب کو فرض قرار دیا گیا اور ان کے چہرے کو کعبہ مرادات اور قبلہ حاجات کہا گیا اس کی تائید میں کچھ روایتیں بیان اور مشائخ ہند کے مریدوں کے کچھ مثالیں پیش کی گئیں، اسی کے بعد بادشاہ انسان کامل اور عادل، ذی شوکت اور ذی شان قرار دیا گیا اس زمانہ کے شیخ یعقوب کشمیری مشہور مشائخ میں سے تھے، بہت سی کتابیں لکھی تھیں، اپنے عہد کے مشہور مقتدا اور پیشوا بھی سمجھے جاتے تھے انھوں نے قاضی عین القضاة ہمدانی کی تمہیدات سے یہ ثابت کیا کہ محمد ﷺ اسم الہادی کے مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم المصل کا مظہر ہے، دنیا کا یہ سارا جلوہ انھی دونوں اسماء سے ہے اور یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، ملا یزدی بھی چارپائی پر معلق اسی طرح جاتے اور خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز و طعن کر کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف اور علمائے خلف وغیرہ کو کافر بناتے، بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گرانے کی فکر میں لگے رہتے اور شیعوں کے سوا تمام لوگوں کو گمراہ بتایا، علما کا یہ حال تھا کہ ایک گروہ ایک چیز کو حرام قرار دیتا تو دوسرا اس کو حلال ثابت کر دیتا اس چیز نے بھی بادشاہ کو بدظن کیا وہ تو اپنے زمانہ کے علما کو امام غزالی اور امام رازی سے بہتر سمجھتا تھا لیکن ان کی ریک حرکتوں کو دیکھ کر پرانے زمانے کے علما کا بھی منکر ہو گیا اس زمانہ میں عیسائیوں کی آمد و رفت دربار میں ہونے لگی تھی جو پادری کہلاتے تھے ان کے مجتہدوں کو پاپا کہا جاتا ہے، ان کو مصلحت وقت کے لحاظ سے

دینی احکام میں تبدیلی کرنے کا اختیار ہوتا ہے جس سے بادشاہ بھی روگردانی نہیں کر سکتا ہے وہ دربار میں انجیل لائے اور عقیدہ تثلیث کے حق ہونے پر دلیلیں پیش کیں اور نصرانیت کو سچا مذہب قرار دے کر عیسائیت کی ترویج کی، بادشاہ کے حکم کے بموجب شہزادہ مراد نے ان سے چند سبق بھی پڑھے، شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمہ کے لیے حکم دیا گیا اس نے ترجمہ شروع کیا تو بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا:

”اے نام وے نژو کرستو“

یعنی اے وہ ذات کہ تو بڑا مہربان اور بہت کچھ بخشنے والا ہے۔

شیخ فیضی نے اس کا دوسرا مصرع یہ کہا:

”سجانک لاسواک یا ہو“

ان ملعون عیسائیوں نے دجال ملعون اور حضرت خیرالنبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں مشابہت پیدا کی، پیر بر ملعون نے بھی بادشاہ کو یہ ذہن نشین کرایا کہ آفتاب کل چیزوں کا مظہر ہے، اسی کی تاثیر سے غلہ، میوہ اور سبزہ پیدا ہوتا ہے دنیا کی روشنی اور دنیا کی زندگی بھی اسی سے ہے اسی لیے وہ واجب التعظیم و لائق عبادت ہے، طلوع کے وقت اسی کی طرف رخ کرنا چاہیے نہ کہ غروب کے وقت جو کہ پچھم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس نے آگ، پانی، پتھر، درخت اور تمام مظاہر یہاں تک کہ گائے، گوبر، قشقہ اور زنار کے تقدس کو بتایا، دربار کے مقرب فضلا و حکمانے بھی اس کی تائید کی کہ آفتاب نیر اعظم ہے تمام دنیا کو عطیہ دینے والا ہے، بادشاہ کا مربی ہے بادشاہ محض اس کے نائب ہیں، اس طرح آفتاب کی تعظیم نور و جلال میں کی جانے لگی، ہر سال اس روز بڑا جشن منایا جاتا، بادشاہ سات سیاروں میں ہر سیارہ کے رنگ کے مطابق روزانہ لباس تبدیل کرتا، ہندوؤں میں تسخیر آفتاب کی دعا ہوتی ہے بادشاہ اس کا وظیفہ آدھی رات اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا، ہندو گائے کی تعظیم کرتے ہیں اس کے گوبر کو پاک سمجھتے ہیں، اس لیے گائے کا ذبح

کرنا، اس کا گوشت کھانا حرام قرار دیا گیا، اس کی خلاف ورزی میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کر دیا گیا، طبیبوں نے یہ ثابت کیا کہ گائے کے گوشت سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس سے ہاضمہ خراب ہوتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۶۱-۲۵۷)

گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا ایک گروہ آ گیا تو اس نے زرتشت کے دین کو سچا بتایا، آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتا کر بادشاہ کو اپنی طرف مائل کیا، کیانی بادشاہوں کے قصے سناتے بادشاہ نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ سلاطین عجم جس طرح اپنے آتش کدہ کو ہمیشہ روشن رکھتے تھے اس کے محل میں آگ جلتی رہے کیونکہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کے انوار میں سے ایک نور ہے بادشاہ اپنی جوانی ہی کے زمانہ سے راجاؤں کی لڑکیوں کی وجہ سے ہوم (ہون) کیا کرتا تھا جو آگ کی ایک پوجا ہے پچیسویں سال جلوس کے نوروز میں بادشاہ نے آفتاب اور آگ کا سجدہ علانیہ کیا دربار کے مقرب بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے، سنبلیہ کی آٹھویں عید کے دن بادشاہ ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ لگا کر دولت خانہ آیا اور جواہرات کی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ میں تبرک کے طور پر بندھوائی، امرانے اپنے اپنے رتبے کے مطابق اس روز جواہرات اور مروارید نذرانے میں دیے، بادشاہ نے راکھی بھی بندھوانی شروع کی، اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو رسم بیان کرتے بادشاہ اس کو نص قاطع سمجھتا اور اسلام کے تمام احکام کو نامعقول قرار دے کر مسلمانوں کو مطعون کرتا کہ یہ عرب کے کچھ مفسدوں اور ہزنوں کے وضع کردہ ہیں.... رفتہ رفتہ یہ چیز اتنی بڑھی کہ اسلام کو باطل قرار دینے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۶۲-۲۶۱)

اسلامی عقائد اور فروعی مسائل پر علانیہ طنز کیا جانے لگا تو بد بخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کی قدح کرنے لگے، علمائے سونے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرائے شروع کر دیا، توحید کے بعد بادشاہی القاب لکھنے لگے ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ

کاذبوں کے مقابلہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی لیں، اس سے بڑی بدنامی ہوئی، ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے لگا اس کے باوجود جو لوگ عوام و خواص میں رذیل اور سفلہ طبیعت کے تھے بادشاہ کی ارادت میں داخل ہو کر اس کے مرید ہونے لگے جس میں لالچ اور خوف کو بھی دخل ہوتا تھا، زبان پر کلمہ حق لانا ناممکن ہو گیا۔ (ایضاً، ص ۲۶۹)

اسی زمانہ میں ایک محضرتیار کیا گیا جس پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر الصدور، قاضی القضاة جلال الدین ملتانی، صدر جہاں مفتی، جہاں مفتی کل، علم العلماء زماں شیخ مبارک، غازی خاں بدخشی جو علم معقول میں بے بدل تھے، دستخط اور مہر تھی اس میں مجتہد شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی، امام عادل کو اس بات کا حق دیا گیا کہ وہ اخلاقی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے تاکہ اس سے کسی کو انکار کی مجال نہ ہو اور اگر ایسا کرے تو ملزم بن جائے، اس محضر پر بڑی لمبی بحث ہوئی، موضوع یہ تھا کہ اجتہاد اور مجتہد کا اطلاق آخر کس پر ہوتا ہے اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبر ہو اور مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کر دے، اس محضر پر بعض نے تو خوشی اور بعض نے کراہت سے اپنی مہریں لگا دیں۔

محضر نامہ یہ ہے:

اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان کی معدلت اور ان کی جہاں بانی کی تربیت عدل و احسان کا مرکز بن چکا ہے خواص و عوام، خصوصاً عرفان شعرا و علما اور دقائق آثار و فضلاء جو کہ بادیہ نجات کے ہادی اور اتوال العلم کے درجات کے سالک ہیں، عرب و عجم سے آکر اس ملک میں ضم ہو چکے ہیں تو ایسے تمام علما جو فروع اور اصول کے حاوی اور معقول و منقول پر حاوی ہیں، دیانت سے اور غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آیہ کریمہ کے پیش نظر اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی

الامر منکم (خدا کا حکم مانو، رسول کا حکم مانو اور ان کا جو تم میں سے صاحب امر ہوں، اس حدیث کی روشنی میں کہ ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطیع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الامیر فقد عصانی وغیر ذلک (خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے پیارا امام عادل ہے جو امیر کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے اور جو امیر کی اطاعت نہیں کرتا ہے میری اطاعت نہیں کرتا ہے) غیر عقلی اور نقلی دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے نزدیک مجتہد کے مرتبہ سے بڑھ کر ہے، حضرت سلطان الاسلام، کہف الانام، امیر المؤمنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ بہت ہی عادل ہیں بہت ہی عاقل ہیں اور بہت ہی خدا ترس ہیں اس لیے اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک مختلف فیہ ہوں تو اپنے ذہن ثاقب اور فکر صائب سے کسی بھی ایک صورت کی تجویز کر کے عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر حکم جاری فرمائیں تو یہ متفق علیہ سمجھا جائے گا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی، اسی طرح اگر وہ ایسا حکم جاری کریں جو عوام کے لیے سہولت کا باعث ہو اور نص قرآنی کے خلاف نہ ہو تو اس پر عمل کرنا ہر شخص کے لیے لازمی اور قطعی ہوگا اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسروان دینی و دنیاوی کا باعث ہوگی، یہ سطور حسبہ للہ اور حقوق اسلام کے اجراء کے خاطر علمائے دین اور فقہائے مجتہدین کے محضر سے ماہ رجب ۹۸۷ھ میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

(ج ۲ ص ۷۲-۷۰)

اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک کے ہاتھ سے لکھا گیا، دوسرے علمائے اس کو کراہت سے لکھا، شیخ مبارک نے خوش ہو کر اس کے نیچے یہ لکھا کہ میں اس بات کا دل و جان سے خواہاں تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا، بادشاہ کو فتویٰ دینے کا اختیار مل گیا تو پھر اجتہاد کی راہیں کھل گئیں، امام کی رائے مستند سمجھی گئی کسی کی مخالفت باقی نہیں رہی، تحلیل و تحریم کا

جھگڑا ختم ہو گیا شریعت کے مقابلہ میں امام کی رائے کو فوقیت ہو گئی۔

(منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۷۲-۲۷۰)

دربار کے کمینے اور ذلیل علمائے جو درحقیقت جاہل تھے باطل دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ وہ اس عہد کے صاحب زماں ہیں، ان کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے، شریف نے محمود بسخوانی کے رسائل سے یہ شہادت بھی پیش کی کہ اس نے صراحتاً لکھا ہے کہ ۹۹۰ء میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا، صاحب دین حق کے کلمہ کے جمل کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں، خواجہ مولانا شیرازی ملحد نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہو چکی ہے اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آ گیا ہے، اس سلسلہ میں اس نے اپنا ایک رسالہ مرتب کر کے پیش کیا..... یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کے لیے تھیں۔

(ایضاً ص ۲۸۷-۲۸۶)

جلوس کے ۲۸ ویں سال میں..... ہجرت کے ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے لیکن بادشاہ نے اپنے زعم میں یہ طے کر لیا کہ اب پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کے ایک ہزار سال ہو چکے ہیں، آپ کے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے اس لیے بادشاہ کے دل میں جو بات پوشیدہ تھی اس کے اظہار میں اب کوئی چیز مانع نہیں رہی، علماء و مشائخ کے اثر و اقتدار کی بساط ٹوٹی ہو چکی تھی، اس لیے بدعہ ائمہ ان سے انکار کیا گیا اور باطل قراوت کے گداور کلموں اور کلاموں کے مفہوم و اعتقاد کے باوجود ان کی ترویج کی جا سکتی تھی، پوپا حکم یہ صادر کیا گیا کہ اب ستم پرائی تاریخ (ہزاروں سنہ) مثبت کیا جائے اور یہ ہزار سنہ بعثت سے (ہجرت سے نہیں) موعود کیا جائے، اسی طرح دوسری نئی اختراعات منسلک تھی کے عنوان سے بطور حکم عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیے گئے کہ مثل حیران رہ گئی،



ایک حکم یہ ہوا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے سجدہ لازم ہے، دوسرا حکم یہ ہوا کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی جائے اور اس کے پینے سے فتنہ اور فساد پیدا نہ ہو تو وہ مباح ہوگی، البتہ اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدست ہو جائے اور وہ شور و غوغا کرنے لگے تو اس کی سزا دی جائے گی، اس رعایت کی خاطر دربار کے دروازہ پر شراب فروش کی ایک دوکان کھولی گئی، اس کا اہتمام دربان کی بیوی کے ذمہ ہوا جو کسی شراب فروش کی نسل سے تھی، شراب کا نرخ بھی مقرر ہوا ہر شخص علاج کے نام پر مشرف سے اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا، لوگ فرضی نام لکھوا کر شراب خرید کر لے جاتے تھے، تحقیق کون کرتا، اس طرح شراب پینے والوں کے لیے دوکان کھول دی گئی لوگوں کا بیان تھا کہ اس شراب کے ساتھ سور کا گوشت بھی اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل کر دیا گیا، واللہ اعلم، احتیاط کے باوجود وہاں فتنہ و فساد رہتا اور لوگوں کو سزائیں دی جاتیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا پورے ملک سے بہت سی فاحشہ عورتیں پایہ تخت میں آ کر جمع ہو گئی تھیں، ان کی تعداد شمار سے باہر تھی ان کو شہر سے باہر بسایا گیا اور ان کی آبادی کا نام شیطان پورہ رکھا گیا، وہاں ایک محافظ، داروغہ اور مشرف مقرر ہوئے جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جاتا یا ان کو اپنے یہاں لے جاتا اپنا نام و نسب لکھا دیتا اس کا رروائی کے بعد ہر شخص ان کے ساتھ زنا کرتا اس اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جاسکتا تھا اگر ان میں سے کنواری لڑکیوں کو اپنے یہاں لے جاتا (اور اگر لے جانے والا کوئی نامی درباری ہوتا تو داروغہ دربار سے اجازت لیتا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بد معاش فرضی ناموں سے یہ کاروبار کرتے اور بدست اور کمینے لوگ خوں ریزی کرنے لگتے، قصاص میں پکڑے بھی جاتے پھر بھی دوسرے لوگ بڑے فخر کے ساتھ یہ کام کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتے، ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور تھیں ان کو بلا کر ان سے پوچھا جاتا کہ ان کا کنوارا پن کس نے ختم کیا جس امر کا نام وہ ظاہر کرتیں ان کو سخت تنبیہ کی جاتی اور ان کو کافی عرصہ تک قید میں

رکھا جاتا، ان ہی میں سے راجہ بیر بر بھی تھا جو بادشاہ کا مخلص مرید تھا اور جو مراتب چہارگانہ (یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین) میں پیش پیش سمجھا جاتا تھا اس نے تو اپنی بیٹیوں کو بھی نہ چھوڑا تھا وہ اس زمانہ میں اپنی جاگیر کو رہ گیا ہوا تھا، جب اس راز کا افشا ہوا تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کر لیا پھر بادشاہ نے عنایت آمیز فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلا لیا۔

(ج ۲ ص ۳۰۳-۳۰۱)

گائے کا گوشت بھی حرام کر دیا گیا بادشاہ شروع سے رند مشرب ہندوؤں کے ساتھ رہا کرتا تھا، ان ہی کی صحبت میں اس کو یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ گائے تمام اقوام عالم کے لیے تعظیم کے لائق ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بیٹیاں اس کے محل میں تھیں وہ اس پر حاوی ہو گئیں، ان کی خاطر وہ گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز سے پرہیز کرنے لگا اور داڑھی رکھنے والوں سے بھی احتراز شروع کیا، اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسموں اور بدعتوں کی پابندی کرنے لگا ان عوتوں اور ان کے خاندان والوں کی دلجوئی کی خاطر اس نے تمام باتوں کو ترک کر دیا جن سے ان کو کراہت ہوتی تھی جو لوگ داڑھی منڈاتے تھے ان کو وہ پسند کرتا تھا، داڑھی منڈوانا عام رواج ہو گیا، ڈاڑھی منڈانے کے متعلق عجیب دلیلیں دی گئیں کہ داڑھی کی آبیاری خسیوں سے ہوتی ہے خواجہ سرا کے داڑھی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے نہیے ناکراہ ہوتے ہیں، اس لیے اس کے رکھنے اور نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے، پچھلے لوگوں میں عبادت گزاری داڑھی رکھنے کو ریاضت سمجھتے تھے ان ہی کو دیکھ کر اور لوگ بھی داڑھی رکھنے لگے، یہ ملاستی فرقہ کے لوگ تھے اب داڑھی نہ رکھنے ہی میں ملامت اور ریاضت ہے، اب اگر داڑھی منڈائی جائے تو نادان فقیہ اور عالم ملامت کریں گے لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس کے برعکس صورت حال ہوگی جو مفتی بے اصول اور سازشی تھے انہوں نے ایک مجہول سی روایت پیش کی جس میں یہ فقرہ تھا: کما فعله بعض القضاة (یعنی جیسا کہ بعض قاضیوں نے کیا) اس میں تحریف سے کام لیا

گیا، عصا کو قضا سے بدل دیا جس کے بعد بجائے گنہگاروں کے یہ مطلب نکالا گیا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈانا تھا، حکیم ابوالفتح جب نئی ملازمت میں داخل ہوئے تھے تو ایک روز انھوں نے میری داڑھی حد شرعی سے کم پائی، انھوں نے میرا ابوالغیث بخاری مرحوم مغفور مبرور کے سامنے مجھ سے کہا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی کم رکھنا زیب نہیں دیتا، میں نے جواب دیا کہ یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں، انھوں نے کہا کہ اب ایسا نہ کرنا یہ بات بدنما اور نازیبا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد حکیم ابوالفتح نے حیدری جوتی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخسار کو بالکل صاف کر دیا اور قابل رشک چھو کروں کی طرح ہو گئے اور موتراشی کی تائید میں مویشگانے کرنے لگے۔

(ج ۲، ص ۲۳-۳۰)

دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی، ان کے تین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی شروع ہوئی، طرح طرح کے لہو لعب جاری ہو گئے، ”کفر شائع شد“ سے اس عہد کی تاریخ نکالی گئی، دس بارہ سال کے اندر یہ صورت ہو گئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھ اور دوسرے مرتد امرانے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ میں اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے انکار کرتا ہوں جس کو میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا آیا ہوں اور اب دین الہی اکبر شاہی میں داخل ہو گیا ہوں جو اخلاص کے چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں، یہ تحریریں جو لعنت نامہ سے کم نہ تھیں، نئی شریعت کے مجتہدوں کے سپرد کر دی جاتیں اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑے اعتماد اور مہربانی سے پیش آتا، قریب تھا کہ آسمان پھٹ پڑتا، زمین دھنس جاتی اور پہاڑ ٹوٹ پڑتے، احکام اسلام کی مخالفت میں سورا اور کتے کو نجس نہیں سمجھا گیا ان کو حرم کے اندر اور محل کے نیچے رکھا گیا، بادشاہ ہرج ان پر نظر ڈالنے کو عبادت سمجھتا تھا، کیوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہن نشین کر دیا تھا کہ سوران دس مظاہر میں سے ایک

مظہر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے..... کتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول نقل کیا گیا کہ اس میں دس صفتیں ہیں، اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن جائے، دربار کے بعض مقرب اور ملک الشعرا فیضی تو اپنے دسترخوان پر کتے کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا، عراق اور ہندوستان کے بعض مردود شعرا اس کی پیروی کرتے تھے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتے کی زبان اپنے منہ میں لے کر پیار کرتے تھے۔ (ج ۲ ص ۳۰۵)

غسل جنابت بھی فرض نہیں قرار دیا گیا اور یہ ساقط ہو گیا دلیل یہ پیش کی گئی کہ انسان ہی کے نطفہ سے نیک اور پاک لوگ پیدا ہوتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانہ کے بعد تو غسل واجب نہیں ہوتا، اس پاکیزہ اور لطیف مادہ کے اخراج کے بعد غسل کیوں کیا جائے، مناسب تو یہ ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔ (ج ۲ ص ۳۰۵)

اسی طرح موت کے دن مردہ کے لیے کھانا پکوانا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیوں کہ وہ تو جمادات میں شامل ہو جاتا ہے، اس کے بجائے پیدائش کے دن جشن منا کر کھانا پکوانا چاہیے، بادشاہ نے اس جشن کا نام آتش حیات رکھا، شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس لیے حلال کر دیا گیا کہ اس کے کھانے سے بہادری پیدا ہوگی، چچا، ماموں اور قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا کہ اس سے ان کے شوہروں کی خواہش کمزور ہو جاتی ہے، مرد کے لیے سولہ سال کی عمر اور عورتوں کے لیے چودہ سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں رکھا گیا چونکہ کمسنی کی اولاد کمزور ہوتی ہے، سونا اور ریشم پہننا فرض قرار دے دیا گیا، ایک روز میں نے حکومت کے مفتی کو خالص ریشم کا لباس پہنے دیکھا تو پوچھا کہ ریشم پہننے کی کوئی روایت نکل آئی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ جس شہر میں ریشمی لباس عام ہو جائے وہاں ریشم پہننا مباح ہے، میں نے کہا بظاہر تو یہ روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ کا یہ حکم ہے، انھوں نے کہا: اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے۔ (ج ۲ ص ۶-۳۰۵)

نماز، روزہ اور حج اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے، بعض ولد الزنا مثلاً ملا مبارک

کے بیٹے شیخ ابوالفضل نے ان کے قدح اور تمسخر میں دلائل کے ساتھ ایک تحریر لکھی جو بادشاہ کو پسند آئی اس پر بڑی نوازش کی۔

عربی کی ہجری تاریخ بھی بدل دی گئی، اس کی جگہ سال جلوس لکھا جانے لگا جو ۹۶۳ ہجری میں ہوا تھا، مہینوں کا تعین عجمی بادشاہوں کے طریقہ پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں ہوا کرتا ہے، زردشتیوں کے عقائد کے مطابق چودہ عیدیں مقرر کی گئیں، مسلمانوں کی عیدوں کی رونق ختم ہو گئی، جمعہ کا خطبہ باقی رکھا گیا کیوں کہ اس میں بادشاہ کا نام ہوتا تھا، اس میں بوڑھے لوگ ہی شریک ہوتے تھے، تنکوں اور مہروں میں تاریخ الفی لکھی جانے لگی، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال کے بعد محمد ﷺ کا دین مبین ختم ہو کر رہے گا، عربی پڑھنا یا جاننا عیب ہو گیا، فقہ، تفسیر اور حدیث جاننے والے مطعون ہو گئے، نجوم، حکمت، طب، حساب، تاریخ اور افسانہ کا علم رائج ہوا، عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا، عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی لکھا جاتا تو بادشاہ خوش ہوتا، فردوسی کے شاہنامہ کے یہ دو شعر بادشاہ کو بہت پسند تھے، ان کو سند بنائے ہوئے تھا۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار عرب و ابجائے رسیدہ است کار

مکہ ملک عجم را کنند آرزو تفو باد بر چرخ گردوں قفو

بادشاہ جو بھی شعر اپنے مشرب کے مطابق اساتذہ سے سن لیتا اس کو سند بنا لیتا، سحر راک کا وہ شعر جس میں حضرت محمد ﷺ کے دندان مبارک کے شہید ہونے کا ذکر ہے اس کو پسند تھا، اسی طرح دین کے ہر اسلامی مسئلہ اور ہر عقیدہ میں جیسے نبوت، کلام، رویت، تکلیف، تکوین، حشر و نشر، خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے، اس پر ہر قسم کے شبہات کا اظہار اس کا تمسخر اور استہزا کیا جاتا، اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تو اس پر روک لگا دی جاتی، کوئی بات قابل تسلیم نہیں سمجھی جاتی، بحث میں مساوی ہونے کی شرط ہے لیکن جبراً جب کسی بات کو منوانے کا اختیار حاصل ہو تو پھر کیا بحث ہو سکتی ہے..... بہت

سے خاندان اس مباحثہ میں پڑے مگر مباحثہ کے بجائے مکاہرہ اور مشاغبہ ہوتا، دین فروش بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے متروک اور مشتبہ باتیں ہر جگہ سے لا کر پیش کرتے، لطیف خواجہ ماوراء النہر کے بزرگ زاووں میں تھا، شمال ترمذی کی اس حدیث کا نہ جیددمیہ کے بارے میں یہ کہتا کہ پیغمبر علیہ السلام کی گردن نوبت سے تشبیہ دنیا کہاں تک درست ہے، اسی طرح ناقہ، قصویٰ کی حدیث کے متعلق جو سیر کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلہ کو لوٹ لینے کے بارے میں رسول اللہ کی چودہ بیویوں اور دوسروں پر ان عورتوں کے حرام ہونے کے متعلق اعتراضات کیے گئے۔ (ج ۲ ص ۸-۳۰۷) رات کو بادشاہ کی مجلس میں حکم کیا جاتا کہ چالیس آدمی جس مجلس میں بیٹھیں اور جو چاہیں سوال کریں، اگر کوئی کسی علمی بات کے متعلق پوچھتا تو کہا جاتا کہ ملاؤں سے پوچھو، یہاں تو عقل و حکمت کی باتیں دریافت کی جائیں، سیر کی کتابیں پڑھی جائیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم اور خصوصاً خلفائے ثلاثہ، قضیہ فدک اور جنگ صفین کے متعلق ایسی باتیں سننے میں آتیں کہ انہیں زبان سے بیان نہیں کیا جاسکتا، شیعی غالب اور سنی مغلوب تھے، نیک بندے خوف زدہ رہنے لگے اور شر پسند محفوظ تھے روزانہ کوئی نہ کوئی نیا حکم نکلتا، نئی قدح جاری کی جاتی طرح طرح کے شبہات پیدا کیے جاتے، اثبات کو نفی کیا جاتا۔ (ج ۲ ص ۳۰۸) مقبول مردود ہو گئے اور مردود مقبول ہونے لگے جو نزدیک تر تھے وہ دور ہو گئے جو دور تر تھے وہ نزدیک تر ہو گئے....

سارے ملک میں بڑا شور و غوغا ہوا ملا شیری نے اپنے ایک قطعہ میں اس زمانہ کا حال اس طرح لکھا ہے۔ (ج ۲ ص ۳۰۹)

فتنہ در کوئے حوادث کے خدا خواہ شدن  
بارس از ذمہ گردن ادا خواہ شدن  
خرقہ پوش زہدرا تقویٰ روا خواہ شدن  
کز خلایق مہر پیغمبر جدا خواہ شدن

تا بزاید ہر زمان کشور بر انداز آفتے  
باعقاب قرض خواہ تیج درار باب شرک  
فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد  
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جا ملے

خندہ می آید مرازیں بیت پس کز طرنگی  
بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است  
نقل بزم منعم و درد گدا خواهد شدن  
گر خدا خواهد پس از سالے خدا خواهد شدند

جشن نوروز کے موقع پر اکثر علماء و صلحا بلکہ قاضی و مفتی شراب پینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

عشقت خبز عالم بے ہوشی آورد  
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد

یاد تو اے نگار چہ معجون حکمت است  
کز ہر چہ خواندہ ایم فراموشی آورد

ان مجتہدوں میں خاص طور پر ملک الشعرا فیضی تو یہ کہہ کر پیتا کہ ہم یہ پیالہ فقیہوں

کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۹-۳۰۸)

ملا عبد القادر بدایونی نے اکبر کی مذہبی پالیسی کی جو تصویر اوپر کھینچی ہے وہ اکبر کی

مذہبی رواداری کو پاش پاش کر کے رکھ دیتی ہے، ملا صاحب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ

انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں خود ان کے مذہبی تعصب اور کٹر پن کو دخل ہے، اس لیے وہ

قابل قبول نہیں لیکن خود ملا صاحب نے لکھا ہے کہ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ان

حالات کو نہ لکھتا لیکن خدائے عز و جل گواہ ہے اور اس کا گواہ ہونا کافی ہے کہ میرے ان

باتوں کے لکھنے کا مقصد صرف اس دین کے ساتھ درد اور ملت مرحوم اسلام کے ساتھ دلسوزی

کے اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے جو عنقا کی طرح اجنبی بن گیا ہے اور اس کے بازو کا

سایہ اس دنیا کے خاک نشینوں پر سے جاتا رہا ہے، میں تو خدا کی قسم ملامت، نفرت، حسد اور

تعصب سے پناہ مانگتا ہوں۔ (ج ۲ ص ۲۷۹)

ملا صاحب کی بے تعصبی پر یقین نہ کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے

اکبر کے زمانہ کے سیاسی واقعات لکھنے میں اس کے احترام کو ہر لحاظ سے باقی رکھا ہے اور کہیں

اس کی سطوت شکنی نہیں کی لیکن اس کے مذہبی عقائد کے سلسلہ میں وہ ضرور بے قابو ہو گئے

ہیں اور ان کے قلم سے اکبر کے دین الہی کو جو زخم پہونچا وہ آج تک مندرج نہ ہو سکا، دین الہی

کی حمایت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ملا صاحب نے جو کچھ لکھ دیا ہے اسی کی روشنی میں

دین الہی سمجھا گیا ہے اور اگر دین الہی واقعی تمام مضحک باتوں سے پاک ہوتا اور یہ قابل قبول سمجھا جاتا تو ابوالفضل کا قلم اس کو گل و گلزار بنا کر رکھ دیتا، اس کا قلم اکبر کے جاہ و جلال دکھانے میں اعجاز بن کر نمودار ہوتا رہا لیکن دین الہی کے ذکر میں اس کا معجزہ نما قلم گونگا بن کر رہ گیا ہے، ذرا اکبر کے مذہبی مسلک کو ہم اکبر نامہ اور آئین اکبری کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو کہ دراصل اس کی کیا حقیقت تھی۔

ابوالفضل اور دین الہی: ابوالفضل پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اکبر کی خاطر وہ اکبر سے زیادہ دین الہی کا علم بردار بن گیا تھا، اس کو اکبر کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا تھا وہ اس کو مذہبی تجربات سے روک سکتا تھا لیکن اپنے حب جاہ کی خاطر ایسا نہ کر سکا (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۹-۲۰) اس سے پوچھا گیا کہ مشہور مذہبوں میں اس کا میلان کس مذہب کی طرف ہے تو اس نے جواب دیا کہ ابھی تو چند دن الحاد کی وادی میں سیر کرنے کا ارادہ ہے، ایک مرتبہ علما نے خفیہ طور پر یہ پیام بھجوایا کہ وہ ان لوگوں کے پیچھے کیوں پڑا رہتا ہے تو اس نے جواب کہلا بھیجا کہ مجھ کو اس حکایت کے مطابق سمجھو کہ میں ایک آدمی کانو کر ہوں بیگن کا تو نو کر نہیں (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۲) شہزادہ سلیم نے تو اس پر یہ الزام لگا رکھا تھا کہ وہ جلوت میں لوگوں کو کچھ اور چیزوں کی ترغیب دیتا رہا لیکن جب خلوت میں ہوتا تو اور ہی کام کرتا، یہ الزام اس نے اس لیے رکھا کہ ایک روز اس نے ابوالفضل کے گھر میں چالیس کاتبوں کو قرآن اور تفسیر لکھتے دیکھا (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۶۱۹) مآثر الامراء میں یہ بھی ہے کہ وہ راتوں کو درویشوں کے گھروں میں جاتا اور اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے دعائیں کراتا۔

(ج ۲ ص ۶۲)

اسی ابوالفضل نے اپنے شاہی آقا کے مذہب کی جو تصویر اکبر نامہ اور آئین اکبری میں کھینچی ہے، اس کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے اس کے سحر طراز قلم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جیسی مخلوق چاہتا الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا اگر وہ اکبر نامہ نہ لکھتا تو اکبر اکبر اعظم نہ



کہلاتا لیکن اپنے آقائے اعظم کے مذہب سے متعلق اس کے جادو نگار قلم میں بہت زیادہ حرکت اور گرمی پیدا نہیں ہو سکی ہے پھر بھی دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا لکھتا ہے:

وہ عبادت خانہ کے مباحث کی تفصیل بہت زیادہ درج نہیں کرتا جیسا کہ ملا عبد القادر نے قلم بند کیا ہے وہ عمومی بات لکھتا ہے، اس کا لفظی ترجمہ تو مشکل ہے لیکن اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، اکبر کے ۲۳ ویں سال جلوس میں لکھتا ہے:

اکبر نامہ اور دین الہی: ذات مقدس کو خدا داد دانش، فنون شناسائی، طراز حال قدس اور غازیہ چہرہ نورانی حاصل ہے لیکن اپنی فطرت کی نیرنگی کے کمال کی وجہ سے وہ اکثر اپنے چہرہ سے پردہ خاص اٹھا کر جہاں بانی کرتے ہیں اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے کردار اور گفتار کا اظہار کرتے ہیں، اب جب کہ اقبال کی صبح نمودار ہو چکی ہے اور بخت مندی کا ستارہ روشنی پھیلا رہا ہے تو ان کی صورتی آگہی پر جو معنوی نقاب پڑ ہوا تھا اسے نفس اور حکمت کے ماہران کا اندازہ لگاتے ہیں، اسی لیے انہوں نے حق جوئی اور معدلت دوستی کی خاطر ایک انجمن کی اساس ڈالی تاکہ ادیان اور ملل کی تشخیص کی جائے اور ان کی حقیقت پہچانی جائے، دلائل و براہین کی تنقیح ہو اور خالص اور ناقص چیزوں میں تمیز پیدا ہو، ایک مختصر مدت میں ایک خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی جس کے بعد تزدیر فروش نمول کے مہمان خانے میں جا کر سو رہے اور جہاں معنی کی ایک بارگاہ بن گئی اور پایہ شناسی کو بلندی عطا ہو گئی، اب جب کہ مرکز خلافت یعنی فتح پور سیکری میں مقدم شاہنشاہی کا فروغ ہوا تو جمعہ کی راتوں کو باطن قدسی نورستانی آباد کیا جاتا، یہاں مدرسہ اور خانقاہ کے دانش اندوزوں کا امتحان ہوتا، صوفی، حکیم، فقیہ، سنی، شیعہ، برہمن، سیورا، چارپاک، نصاریٰ، یہود، صابی، زردشتی وغیرہ اس محفل ہمایوں میں منبر پر خدیو کے بے غرض اور فارغ البال دیکھ کر نشاط حاصل کرتے اور کسی خوف کے بغیر رازوں کا گنجینہ کھولتے، ہر گروہ کے انصاف نواز اور حقیقت بین اپنی رعونت اور خود پرستی کو چھوڑ کر ژرف نگاہی سے کام لیتے، خود آرا اور لجاج پیشہ لوگ اپنی بدگوہری، کم اندیشی، غرور

کی وجہ سے نقصان میں رہے اور ان کی رسوائی ہوئی، خدیو گہبان کی دیدہ وری اور حق جوئی کی وجہ سے انجمنوں کا انتظام شاید رہتا، دل و دیدہ کوتاہ جلا حاصل ہوئی، زندہ داری کی رات کے چراغ میں تابش پیدا ہوئی، تقلید کی تاریکی میں شمع تحقیق کی فروزاں ہوئی، مدرسہ اور خانقاہ کے لوگوں کو کسوٹی پر کسا گیا، اس دین آرائی کے طرز سے دنیا کے چاہنے والوں کے لیے اپنا وطن بھی تلخ ہو گیا اور وہ اپنی اجنبیت ہی کے دوست ہو گئے، شاہنشاہ کی بارگاہ ہفت اقلیم کا وطن اور دانا یان ملل و نخل کا مرکز بن گیا، حیلہ اندوزوں کی زرا اندزوی کار از ظاہر ہو گیا، بعض تہی مغز ہرزہ سراؤں نے اپنے بازار کی گرمی باقی رکھی اب سے پہلے ان کی زبان درازی کی وجہ سے حقیقت سے فرار حاصل کر لیا جاتا تھا لیکن خدیو گہبا کی دور بینی، بے غرضی اور تحمل کی وجہ سے ایسے لوگ شرمندہ ہوئے اور گمنانی میں پڑ گئے اور حقیقت کی تلاش کرنے والے خمول سے باہر نکل کر بلندی کی راہ پر گامزن ہوئے، عقل کو پایہ فراز حاصل ہوا، تعصب، تقلید اور چرب زبانی کا نقاب ظاہر ہوا ان بدگوہروں نے خدیو خدا پرست کے خلاف زبان کھولی اور ہرزہ سرائی اور زیادہ گوئی شروع کی لیکن ان کی بدسگالی کوئی کام نہ آئی، عاطفت پناہی کی تابش دھیمی پڑ گئی اور شاہنشاہ نے اپنی صوری و معنوی وسطوت ظاہری و باطنی کی وجہ سے ایسے گروہوں کی طرف توجہ نہ کی، اپنے دل اور زبان کو نفرت سے باز رکھا اور خاطر مقدس پر گرد ملال جمنے نہ دی اور ایسے لوگ تھوڑے ہی زمانہ میں اپنی ہستی سے محروم ہوئے..... اور اس وقت خدیو خداوندان علم لدنی کے مرکز ہیں اور جوق کے جوق لوگوں کے مشکلات کو اپنے لوا مع باطن سے دور کرتے ہیں۔ (اکبر نامہ، ج ۳ ص ۵۳-۲۵۲)

اس عبادت گاہ کا یہ عمومی انداز بیان موجودہ دور کے ناظرین کو تشفی نہیں دے سکتا، یہ تو ایک درباری مؤرخ کا جیسا بیان ہونا چاہیے ویسا ہی ہے، عبادت خانہ کے تمام مباحث کا ذکر ضروری تھا صرف ایک بحث کا ذکر آیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز ایک عیسائی پادری نے یہ تحدی کی کہ وہ انجیل ہاتھ میں لے کر آگ میں کود سکتا ہے اس طرح کوئی قرآن لے

کراگ میں کودے جو زندہ رہے وہی حق پر سمجھا جائے، پادری کی اس شرط کو ماننے کے بجائے لوگ تعصب اور بیہودہ گوئی کا اظہار کرنے لگے جو حضرت شہنشاہ کو پسند نہ آیا اور انہوں نے فرمایا کہ بعض ظاہری باتوں کی پابندی کو اصل سمجھتے ہیں، باطن کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے، اس لیے برہمنوں کو اپنے بزرگوں کے مذہب کو قبول کرنے کے لیے ڈراتے اور دھمکاتے ہیں لیکن مستقل دلیل سے جب دماغ روشن نہ ہو کسی بات کو قبول کرنا سود مند نہیں۔

طاعت آں نیست کہ بر خاک نہی پیشانی      صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

اس طرح حضرت شہنشاہ نے تمام مذاہب کی جو اچھی باتیں تھیں ان کا ذکر کر کے ان کی تعریف کی اور فرمایا کہ دلیل کے ذریعہ کسی بات کو ماننا انصاف ہے، اس طرح دل کے قفل کی کنجی کھل سکتی ہے، اسی روشنی میں انہوں نے ہندوستان کے باشندوں کی تعریف کی کہ وہ وفاداری، مال، جان، ناموس اور دین کی خاطر جان دینے میں دریغ نہیں کرتے، یہاں کی عورتیں اپنے کورا کھ کا ڈھیر بنانے میں تامل نہیں کرتیں، شہنشاہ نے عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ انہوں نے عورتوں کو عزت ضرور دے رکھی ہے ان کے یہاں ایک سے زیادہ کی شادی کی اجازت نہیں، اسی طرح وہ وفادار ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ہندوؤں کے یہاں بہت سی ہم خواب عورتیں ہوتی ہیں، ان سے لاپرواہی برتی جاتی ہے، ان کی صحیح قدر نہیں ہوتی پھر بھی وہ وفادار ہوتی ہیں اور محبت کے شعلوں میں جلتی رہتی ہیں۔

(اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۷-۲۵۵)

۲۳ ویں سال جلوس اکبر نے امام اور مجتہد روزگار ہونے کا اعلان کیا اس کی تفصیل

ابوالفضل نے خود لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ژرف نگاہوں کی نگاہ میں حضرت شہنشاہ بزبان نفس قدسی اور دانش اندوز در سگاہ

ہو گئے، نفس قدسی سے ان میں تابش پیدا ہوتی گئی، ان کا نور ولایت اپنا پر تو دکھانے لگا،

انہوں نے دانش آموزی کا چراغ روشن کیا ان کی جادو نفسی، سحر طرازی کا شور برپا ہوا، ان کی

کاردانی کی یک رنگی کو بلندی عطا ہوئی، چشم بینا رکھنے والوں نے ان کو جہانِ انفس کا پیشوا تسلیم کر لیا لیکن جو لوگ تقلید سے گرد آلودہ ہو رہے تھے، وہ تعجب میں پڑ گئے لیکن اس دن کی محفل عالی کو بزم حقیقت کی روشنی ملنے لگی، آگاہ دل دیدہ وروں کے بخت بیدار ہو گئے، ان کی سعادت اسی میں تھی کہ واہ ان کے اجہتات کے قائل ہو جائیں، اگرچہ اجہتادان کے نفس قدسی کے پایہ سے فروتر تھا مگر دانش اندوزان سعادت طرازان کو اجہتاد کرنے کے لایق تصور کرنے لگے، کیوں کہ ان کے اجہتاد ہی سے مذاہب اور عقائد کی گرہ کشائی ہو سکتی ہے جب اس کی خبر سمع قدسی میں پہنچی تو اس کے لیے وہ راضی نہ ہوئے لیکن دیدہ درلابہ گری پر اتر آئے اور اپنی بڑھتی ہوئی خواہش کا اظہار کیا۔

لیکن شہنشاہ تو مراد بخشی، چارہ گری، کار آسانی کے لیے مشہور تھے اس لیے ان کی دور بینی اور انجام رسانی نے ان پر یہ پرتو ڈالا کہ جہان معنی کی سپہ سالاری سے اس پایہ پر اتر آئے تو یہ محض اپنے اوپر پردہ اور نقاب ہی ڈالنا ہوگا اور دوسروں کو خوشی حاصل ہوگی، اس لیے انھوں نے یہ تجویز منظور کر لی، دانشوروں کا ایک اجتماع ہوا اور ان کے امام وقت اور مجتہد روزگار ہونے کا اعلان کیا اور شہنشاہ نے اپنی حقیقت پڑو ہی سے اس کو منظور کر لیا، مولانا عبداللہ سلطان پوری، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدرو شیخ الاسلام، غازی خاں بدخشی، حکیم الملک اور دوسرے بزرگ دانش واران روزگار نے اس پر دستخط کیے، اس کے بعد بادیہ شکوک کے سرگردانوں اور اوہام پرستوں کے لیے ایک راستہ متعین ہو گیا، تاریک نشینوں پر یقین کا پرتو پڑنے لگا، بے گانگی کے لیے آشنائی کا چراغ روشن ہو گیا پراگندہ دلوں کو آرام اور نشاط حاصل ہوا۔

اسی کے بعد سمع ہمایوں میں یہ بات پڑی تھی کہ ائمہ ہدیٰ اور خلفائے راشدین عبادت کا کام دوسروں پر نہیں چھوڑتے تھے اور اپنے دوش ہی پر سنبھالتے تھے، اس لیے حضرت شاہنشاہ کے نور آگس باطن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اس کی پیروی کریں اس

لیے دارالخلافہ کی جامع مسجد جاتے وہاں لوگ ان سے سعادت حاصل کرتے، میرے بھائی ابوالفیض فیضی نے ان کے لیے یہ منظوم قطعہ لکھا:

بنام آں کہ مارا خسروی داد      دلِ دانا و بازوی قوی داد  
بہ عدل و داد مارا رہ نموں کرد      بجز عدل از ضمیر ما بروں کرد  
بود و شفقت ز حد فہم برتر      تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

اس سے سعادت اندوزان نیک اختر کی بخت مندی میں اضافہ ہوا لیکن تیرہ راتے رکھنے والوں کو دکھ پہونچا، ایسے لوگ پرانی رسم کے بموجب یادہ گوئی کرنے لگے، ہر طرف شورش ہوئی اور بدگوئی ہونے لگی ان میں کچھ لوگوں نے اس یگانہ بندۂ ایزدی پر دعوائے خدائی کی تہمت رکھی اور جو لوگ نصیری کے مشرب اور حسین بن منصور کے مسلک کے تھے ان کو مظہر حق سمجھنے لگے لیکن حضرت اورنگ نشین اقبال کا مسلک صلح کل رہا اس لیے ان ہرزہ گویوں اور آشفقتہ عقل اور پریشان ضمیر رکھنے والوں کی سرزنش نہیں کی بعض مفتریوں نے یہ بات پھیلانی کہ خسرو زمان اپنے کو پیغمبر منوانا چاہتے ہیں، یہ اس لیے بھی شاہنشاہ حکمت پڑوہ طرح طرح کے قوانین بنا کر دین و دنیا کے چہار چمن کو شادادت کرنا اور تمام شکوک اور کوتاہ بینی کو دور کرنا چاہتے تھے ان کا منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا بداندیشوں کے لیے مزید ثبوت تھا، بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہو گیا سخن سازی اور فتنہ جوئی کا بازار گرم ہو گیا۔

جب ان ٹاٹھائیوں اور بدگوہروں کی باتیں سامعہ اقبال میں پڑیں تو ان کو اعتبار نہ آیا اور وہ بارہا فرماتے کہ ”ان نادانوں کے ذہن میں یہ بات کیسے آئی کہ الوہیت کے ساتھ امکانی حدوث ملوث ہو جائے اور ہادیان آفاق جن سے عجیب و غریب معجزوں کا اظہار ہوا ان کی طرح نبوت کا دعویٰ کرنے کا خیال پیدا ہوا، ظاہر نگاہ رکھنے والوں نے ایسی تباہ خیالی اپنے دل میں کیوں آنے دی، ایسے تباہ طائفے اور تیرہ راتے رکھنے والوں کی سرزنش کرتا، ملامت اور طنز کرنا بے کار ہے، اسی طائفہ نے یہ مشہور کیا کہ یہ شہر یار آفاق دین

دین احمد کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خسرو دانا دل اپنے مشرب کی خرابی اور اپنی مہر افزائی کی وجہ سے ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ دوستی سے پیش آتے اور ہر مذہب کے دانش پڑھوں سے ان کے مذاہب کی باتیں جاننے کی کوشش کرتے، کم پڑھوں اور بے دانشوں کے جوابات قبول نہیں کرتے، عیسائیوں کے فیلسوف محفل میں بحث کرتے اور فقیہوں پر حملہ آور ہوتے فاضلانہ مباحث ہوتے حیلہ سازوں کے پاس علم نہ ہوتا اس لیے وہ شورش کرتے وہ شہنشاہ کے سامنے تو شرمندہ ہو جاتے لیکن تنہائی میں اپنے دم سازوں سے یہ مل کر یہ کہتے کہ اب دین کا غم کرنا ہے کیوں کہ بادشاہ وقت اپنی جانب داری کی وجہ سے ہمارے جوابات قبول نہیں کرتا اور یہ برنہاد طرح طرح کی تہمت رکھتے ان کو اپنی تیرہ دلی اور آشفٹہ سری کی وجہ سے اس پر نظر نہیں گئی کہ شہنشاہ آل رسول کا احترام کس طرح کرتے ہیں، یہ بہت سے سادات خدیو اعظم کی توجہ کی بدولت مراتب عالی اور بڑے مناصب سے سر بلند ہوتے اور وقتاً فوقتاً اپنی منزلت سے سرسبز اور شاداب ہوتے رہتے ہیں، سادات کے لیے ممنوع تھا کہ وہ حضرت شہنشاہ کی قدم بوسی اور تخت کی ناصیہ سائی کریں کچھ کج بینوں اور بداندیشوں نے اس پاک باطن شہنشاہ پر یہ الزام بھی رکھا کہ وہ شیعہ ہو گئے ہیں، یہ مشہور کر کے سادہ لوح سینوں کو اور غلایا اس کی وجہ یہ تھی کہ محفل میں اور دوسرے مذاہب والوں کی طرح شیعہ سنی بھی ہوتے ان میں بھی بحثیں ہوتیں اور شہنشاہ آگاہ دل اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے ان ہی باتوں کو تسلیم کرتے جو قابل ترجیح ہوتیں۔

کو تاہ بینوں نے ان کی اس توجہ خاطر کو پسند نہیں کیا اور زیادہ گوئی پر اتر آئے، وہ ایرانیوں پر اعتبار کرتے ان میں زیادہ تر شیعہ تھے اس سے بدگمانی پیدا ہوئی اور عربہ جو یوں نے اپنی بداندیشی اور تقلید پرستی سے فتنہ کھڑا کیا کہ وہ شیعیت کے طرفدار ہیں، حالاں کہ ایسے لوگوں کی آنکھوں پر تعصب کا پردہ پڑا تھا اپنی نادانی اور بہانہ جوئی سے نورانیوں کی ترقی کو نہیں دیکھتے تھے، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی ناپاک طبیعت کی وجہ سے خدا شناسوں کے

قافلہ کے اس سردار کو برہمن کہہ کر ملامت کرنے لگے، صرف اس لیے کہ اس دیدہ و رشہ ریار نے اپنی فراخ دلی کی بنیاد پر دانش ور برہمنوں کو اپنے سے قریب تر کیا اور ہندوؤں کو اپنے ملکی مصالح کے خیال سے ان کو عہدے دیے اور تمدن کے فروغ کے لیے ان سے مہربانی سے پیش آئے، ان بدگوہروں کو تین چیزیں ناپسند تھیں، دربار میں تمام ملل و نخل کے دانشوروں کا اجتماع ہوتا ہر مذہب میں اچھی چیزیں ہوتی ہیں، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بری چیزوں کی خاطر اچھی چیزوں پر پردہ نہ ڈالا جائے، دوسرے یہ ہے کہ دربار میں صلح کل کی حکمت عملی کو رونق ہوئی جس سے بہت سے گروہوں کو گونا گوں کامرانی حاصل ہوئی، تیسرے یہ ہے کہ کج رائے اور بری سرشت رکھنے والے فرومایوں کو ان کی نادانی کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑا اور وہ اپنی بے دانشی کی وجہ سے اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

(اکبر نامہ ج ۲ ص ۷۴-۲۶۸)

اکبر نے ۲۵ ویں سال جلوس میں ابوالفضل نے ان ضابطوں کو قلم بند کیا ہے جو اس کے قول کے مطابق خدا شناسی کی خاطر جاری کیے گئے، ابوالفضل کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت شہنشاہ نے خدا شناسی کی خاطر کچھ ضابطے مقرر کیے جو یہ تھے: سال کے بارہ حصے ہیں اس لیے ۱۔ سچاق آئیل میں چوہے نہ مارے جائیں ۲۔ اوواٹیل میں بیل کو مضبوط کر کے کسانوں کو نذر کیے جائیں ۳۔ بارس آٹیل میں چیتے کا شکار نہ ہو ۴۔ تشکان آٹیل میں خرگوش کا شکار نہ کیا جائے ۵۔ لوی آٹیل میں مچھلی کا شکار نہ ہو ۶۔ اہلان آٹیل میں سانپ نہ مارا جائے ۷۔ لونٹ آٹیل میں گھوڑے نہ مارے جائیں اور نہ ان کا گوشت کھایا جائے ۸۔ قوی آٹیل میں بھیڑ نہ ذبح کی جائے ۹۔ موچوں آٹیل میں بندروں کا شکار نہ ہو ۱۰۔ انخا قواٹیل میں مرغ نہ ذبح کیے جائیں اور نہ لڑائے جائیں ۱۱۔ آیت آٹیل میں کتے شکار میں استعمال نہ کیے جائیں اس وفادار جانور سے دوستی کا ثبوت دیا جائے ۱۲۔ مشکو آٹیل میں سوروں کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ (اکبر نامہ ج ۳ ص ۳۳۳-۳۳۳)

اکبرنامہ میں اکبر اعظم کے مذہب کی تفصیل تو اتنی ہی ملتی ہے لیکن آئین اکبری سے مزید تفصیلات حاصل ہوتی ہیں، ابوالفضل نے دین الہی کا نام کہیں نہیں لیا ہے، رہنموی (ج ۱ ص ۱۱۰-۱۰۸) کے عنوان سے آئین اکبری میں اس کی تفصیل اسی انداز میں لکھتا ہے جس میں اس نے پوری آئین اکبری لکھی ہے، رہنموی کی ابتداء میں تو پہلے وہ یہ لکھتا ہے کہ پروردگار عالم مشیت سے انسانی نگاہ دورنگی کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے ہر شخص ایک نیا دین اپنے لیے منتخب کر کے اپنی دنیا میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرے گروہ کی مذمت اور توہین میں اپنا وقت صرف کرتا ہے بداندیشی اور کوتاہ نظری نمودار ہوتی ہے قدر شناسی اور مہر اندوزی جاتی رہتی ہے ورنہ دین کیا دنیا کیا، ایک حسن دل افروز ہے جو چند ہزار پردوں کو چمکاتا ہے ایک لمبی چوڑی گلیم بچھی ہوئی ہے، یہ گونا گوں رنگ کے ساتھ چہرہ کو روشن کرتا رہتا ہے۔

درحقیقت نسب عاشق و معشوق یکے است      بوالفضولاً صنم و برہمنے ساختہ اند  
یک چراغ است دریں خانہ داز پر تو آں      ہر کجای نگرم انجے ساختہ اند  
ایک شخص نفس کی لعنت و ملامت کو اپنا <sup>مطمح</sup> نظر جانتا اور دوسرا اہل جہاں کی نگہبانی کو خود الہی اور اپنی حفاظت خیال کرتا ہے، ایسے ہی مختلف گروہ کے لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں اور خواب و خیال میں مسرور و شادمان نظر آتے ہیں، مگر جب یہ عادتیں ترک کر دیتا ہے تو تقلید کا تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے سامنے یک رنگی کا چہرہ نمودار ہوتا، دانائی کا چراغ ہر گھر میں روشن نہیں ہوتا اور ہر دل میں شناخت کی پذیرائی نہیں ہوتی اور اگر کسی کو یہ شناخت ہو جاتی ہے تو وہ اظہار کرنے سے ڈرتا ہے اور اپنی جان کے خوف سے خاموشی اختیار کر لیتا ہے اور اگر کوئی اپنی پردلی سے کچھ کہنے لگتا ہے تو کم فہم لوگ اس کو دیوانہ سمجھ کر اس کے قول کو قابل اعتبار نہیں قرار دیتے اور بدگوہر اور نافر جام لوگ اس کو کافر و ملحد کہہ کر اس کی زندگی تمام کر دیتے ہیں لیکن جب کسی قوم کی بخت مندی سے ایسا وقت آتا ہے



کہ حق پرستی اس کے حسب حال ہو جاتی ہے اور مشیت الہی کا تقاضا ہوتا ہے کہ لوگ حق پرستی کے برکات سے مستفید ہوں تو ایسا بادشاہ اور فرماں روا پیدا ہوتا ہے کہ جہاں معنی کی پیشوائی بھی اس کے حوالے کر دی جاتی ہے اور کسی واسطے کی بغیر اس کو علم حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے دل سے دوئی کا نقش مٹ جاتا ہے اور وہ کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے اور شادی و غم اور نچ و الم کے جذبات سے خالی ہو زندگی بسر کرتا ہے یہی حال ہمارے زمانہ کے فرماں روا کا ہے شروع ہی سے آثار پیشانی سے صاحب پیشانی کی رفعت و منزلت کا اندازہ ہو رہا تھا، دور بین شہریار نے ایک عرصہ تک اپنی ذات کو مذہب بیگانہ کے پردہ میں مخفی رکھا اور اپنے کو اس خدمت کا مستحق ظاہر نہ ہونے دیا لیکن جس چیز کو خدا چاہتا ہے اس کے روکنے کی کون قدرت رکھتا ہے مگر مجبوراً اللہ تعالیٰ کو رضا مندی کی خاطر رہنموی اختیار کی، اس تمہید کے بعد ابوالفضل لکھتا ہے:

ہدایت شروع ہوئی تو تشنہ دل سیراب ہونے لگے جب حقائق و معارف کا ظہور ہوا تو اہل زمانہ کو تعجب ہوا لیکن اس رہنمائی سے سعادت کا ایک شہر ستارہ آباد ہو گیا اور اکثر مخلصین قلیل مدت میں عرفان کی اس منزل تک پہنچ گئے جہاں روحانی مجاہدین حیلے کر کے بھی قدم نہیں رکھ سکے، ارباب تجرد، سنیا سی، جوگی، سیورہ، قلندر، حکیم، صوفی اور ہر طرح کے لوگ سپاہی، سوداگر، کسان وغیرہ حاضر ہونے لگے اور ان کی آنکھیں حقیقت سے آگاہ ہونے لگیں، ترک، تاجیک، فرد، بزرگ، آشنا، بیگانہ، دور اور نزدیک سے آگئے اور اپنی مشکلات ان کو دیکھ کر حل کرتے اور جو لوگ دوری کی وجہ یا ہجوم کی وجہ سے پہنچ نہیں پاتے تو غائبانہ اپنے تئیں تیار کرتے اور سپاس گذاری بجالاتے جب کبھی وہ ملک کے انتظامی امور یا تسخیر یا سیر و شکار کے لیے سفر کرتے ہیں تو شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ہوگا جہاں کے مرد و عورت جوق کے جوق اپنے ہاتھوں پر نذرانے لے رکھے اور زبان سے شکر یہ ادا کرتے ہوئے نہ آتے ہوں وہ اپنی جبین کو رگڑتے ہوئے کہتے ہیں، ہم نے آپ کی نذرمانی

تھی جس سے ہمارا کام آپ کی دستگیری کی وجہ سے پورا ہوا لوگ اپنے کردار کی اچھائی، صحت و تندرستی، آنکھوں کی روشنی، بیٹے کی پیدائش، دوستوں سے ملنے، زندگی کے دراز ہونے، جاہ و مال کی افزائش اور آرزوں کے بر لانے کی درخواست کرتے، حقیقت شناس بادشاہ ہر ایک کو شایستہ جواب دیتے اور ان کی سر آنگی کا علاج کرتے، کوئی دن ایسا نہ گذرتا کہ لوگ کوزہ میں پانی لے کر حاضر نہ ہوتے اور اس کو دم دینے کی درخواست نہ کرتے، آسمانی حروف کے سر نوشت کو پڑھنے والے بادشاہ ان کو نوید امید سنانے اور پانی کو آفتاب کو روشنی میں رکھ دیتے اور اس کی تمنا کو پورا کرتے، بہت سے بیمار جو اچھے نہیں ہوتے اس طلسم الہی سے شفا یاب ہو جاتے، ایک شخص نے اپنی زبان کاٹ کر آستان والا پر ڈال دی اور بولا کہ اگر مجھ کو خدا نے سعید پیدا کیا ہے اور عقیدہ صحیح ہے تو میری زبان درست ہو جائے گی، زیادہ دن نہیں گذرے کہ اس کی تمنا پوری ہوئی جو شخص بادشاہ کی خدا شناسی اور حق پرستی سے واقف ہے وہ ان عجائب کا زیادہ خیال نہیں کرتا۔

فرخ حوصلہ شہریار کو اپنی خوبیوں پر کم نگاہ ہے جو شخص ان کی ارادت میں داخل ہوتا ہے وہ اس کو قبول کرنے میں تاخیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب ہم ہی خود رسیدہ نہ ہوں تو کیسے رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی طالب کی پیشانی میں سچائی کی نشانی دکھائی دیتی ہے اور اس کی طلب روز بروز بڑھتی جاتی ہے تو اس کو اپنی مریدی میں قبول فرما لیتے ہیں، اتوار کے روز آفتاب عالم تاب کی روشنی میں اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے اس مشکل کے باوجود ہزاروں آدمی اپنی عقیدت کو دوش پر رکھ کر سلسلہ ارادت میں داخل ہوتے ہیں، یہ سعادت ابدی حاصل کرتے وقت طالب دستار کو ہاتھ پر رکھ کر سر نیاز پائے مبارک پر رکھ دیتا ہے اور زبان حال سے کہتا ہے کہ میں اپنے بخت کی یادری اور رہنمائی کی بدولت خود آرائی اور خوشن گزینی یعنی ریا کاری سے منہ موڑتا ہوں کہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اور عقیدت مندوں میں داخل ہوتا ہوں تاکہ حیات جاوید حاصل ہو، ایزد شناس بادشاہ اپنے دست

مبارک سے اس کا سراٹھا کر دستار اس کے سر پر رکھتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ طالب کی دستگیری فرمائی اور ہست نما ہستی نے اپنی حقیقی ہستی کو قبول کیا اور اس کو ایک شصت خاصہ (شاید چادر یا کوئی کپڑا) عطا کرتے ہیں جس پر اسم اعظم یعنی اللہ اکبر کندہ ہوتا ہے جس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔

### شصت پاک نظرے پاک خطانہ کند

بندگان درگاہ ان عجیب و غریب حالات کو دیکھ کر رہنمائی حاصل کرتے اور سر چشمہ رفیض الہی سے سیراب ہوتے ہیں۔

مرید جب آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ایک اللہ اکبر اور دوسرا جلت جلالہ کہتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ یاد الہی میں سیراب دل، تر زبان اور شیریں کام ہوتے رہیں اور سرچشمہ ہستی کو فراموش نہ کریں، بادشاہ کا حکم تھا کہ جو خیرات عام طور سے مرنے کے بعد کی جاتی ہے وہ ان کے مریدین اپنی زندگی ہی میں کریں، اس طرح سفر آخرت کا سامان پہلے ہی کریں، یہ بھی حکم تھا کہ مریدین اپنی ولادت کے روز ایک دعوت کریں اور دسترخوان پر طرح طرح کی نعمتیں رکھیں تاکہ دور دراز سفر کے لیے زاد راہ مہیا ہو جائے، مریدوں کو یہ حکم بھی تھا کہ گوشت کھانے سے حتی الوسع پرہیز کریں، دوسروں کو گوشت کھلائیں لیکن خود ہاتھ نہ لگائیں اپنی ولادت کے مہینے میں گوشت کے پاس بھی نہ جائیں، مریدین اپنے ذبیحہ کے پاس نہ جائیں اور نہ اس کے گوشت کو کھانے کی خواہش کریں مریدین قصاب، ماہی گیر اور چڑھیمار کے ساتھ کھانا پینا نہ رکھیں، حاملہ، بوڑھی اور بانجھ عورت اور نابالغ لڑکیوں کے ساتھ ہمبستر نہ ہوں۔ (آئین اکبری ج ۱ آئین، ۷۴ ص ۱۱۰-۱۰۸)

اکبر کے مذہبی خیالات کا اندازہ آئین اکبری کے ان ٹکڑوں سے بھی ظاہر ہے:

گیہان افروز یعنی بادشاہ اپنی روشن دلی سے روشنی کو عزیز رکھتے ہیں اور اس نور دوستی یعنی اس کی تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الہی قرار دیتے ہیں، نادان اور تیرہ خاطر لوگ

اس کو خدا فراموشی اور آتش پرستی کہتے ہیں لیکن نذرف بین حضرات اس کو اچھا سمجھتے ہیں جب پاک صفات چیزوں کی ظاہری صورت کی تعظیم کرنا قابل ستائش ہے تو ایسے بڑے عنصر (یعنی روشنی) کی تعظیم کرنا جو انسانی ہستی کا سرمایہ اور اس کی بقا کا سبب ہے، کیوں کہ سزاوار نہ سمجھا جائے اس کے علاوہ کوئی اور کم مایہ تصور ذہن میں نہیں گذر سکتا۔

اسی لیے جب ایک گھڑی دن باقی رہتا ہے تو خدیو عالم اگر سواری پر ہوتے ہیں تو نیچے اتر جاتے ہیں اور اگر سوتے رہتے ہیں تو بیدار ہو جاتے ہیں اور یکسو ہو کر ظاہر کو باطن کے رنگ سے رنگ لیتے ہیں، آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت گزار سونے اور چاندی کی بارہ لگن میں کافوری شمعیں جلاتے ہیں اور بادشاہ کے حضور میں لاتے ہیں، ایک اچھا گانے والا شمع کو ہاتھ میں لے کر خدا کا شکر بجالاتا ہے اور طرح طرح کے گانے گاتا ہے اور آخر میں بادشاہ کی روز افزوں ترقی کی دعا کرتا ہے اور آخر میں یہ کہتا ہے کہ گیتی خدیو کے مینار کا پایہ بلند اور اس کو تازہ فروغ یعنی نور معرفت حاصل ہو۔

(آئین اکبری ج ۱ ص ۲۹-۲۸)

ابوالفضل آئین شہاروزی کے عنوان سے لکھتا ہے:

منعم کی سپاس گذاری اور اس کی حمد کرنا ناگزیر ہے، نور الانوار یعنی آفتاب جہاں تاب کی فیض گستری سے ہر شخص مستفید ہوتا ہے اور اس کی برکتوں کا شمار کرنا ممکن نہیں، سلاطین کو اس آسمانی تخت کے سلطان سے خاص تعلق ہے اور وہ اسی سے تربیت پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ گیتی خدیو آگ کی تعظیم کرتے ہیں اور چراغ کی نگہداشت میں بھی خاص اہتمام کرتے ہیں، آگ ہو یا چراغ ہو، تمام روشن چیزوں کو اسی نیر اعظم کے حسن کا پر تو خیال فرماتے ہیں، کج فہم اور کم عقل والے لوگ جو تقلید پر کار بند ہیں، بادشاہ کے اس فعل کو آتش پرستی اور آفتاب معبودی سمجھتے ہیں اور ہنتے ہیں۔ (آئین اکبری ج ۱ ص ۱۰۵)

آئین اکبری میں دلاویز گفتار شہنشاہ ہی کے عنوان سے ابوالفضل نے اکبر کے

جو اقوال نقل کیے ہیں ان سے بھی اکبر کے مذہبی خیالات کا اظہار ہوتا ہے جس میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ انسان کی برتری عقل کی وجہ سے ہے، انسان کو چاہیے کہ اس کے زنگ کو دور کرے اور اس کی فرمان پذیری سے سرتابی نہ کرے۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۱۷۹)

۲۔ ہر آدمی خود اپنا مرید ہے اگر اس کے قلب میں صحیح روشنی موجود ہے تو وہ خود پیشوا ہے اور اگر اپنی عقل کی تابش کو کسی اپنے سے زیادہ شایستہ کی مریدی سے بڑھاتا ہے تو خود رہنما ہے۔

۳۔ تقلید پرستی کی برائی اس سے ظاہر ہے کہ اگر تقلید بہتر ہوتی ہے تو پیغمبر بھی اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے۔ (ایضاً)

۱۔ قدما کا خیال ہے کہ سخت ترین بلائیں پیغمبروں پر نازل ہوئیں اس کے بعد اولیا اور پھر مرتبہ بہ مرتبہ نیک آدمیوں پر آتی ہیں، مجھ کو اس بات پر یقین نہیں آتا کہ خدا کے مقبول بندوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں، رسمی ملاؤں نے یہ عرض کیا کہ یہ محض خدا کی آزمائش ہے، اس پر فرمایا کہ یہ آزمائش ان کے لیے کیسے ہو سکتی ہے جو ظاہر اور پوشیدہ باتوں کے جاننے والے ہیں۔ (ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰)

۲۔ انسان کے اس فعل پر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں کے ختنہ کی سنت کو ناگزیر سمجھتے ہیں جو فرائض کے بار سے سبکدوش نہیں ہوا۔ (ایضاً)

۳۔ اگر سور کی حرمت اس کی بے عزتی کی وجہ سے ہے تو شیر اور اس طرح کے اور جانوروں کے لیے حلال ہونا لازمی ہے۔ (ایضاً)

۴۔ تکفین محض رسمی چیز ہے، مردہ کیوں کر یہ بوچھلا دسکتا ہے جس طرح وہ آیا اسی طرح اس کو جانا چاہیے۔ (ایضاً)

۵۔ بچوں کے بیمار پڑ جانے سے تباخ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۸۷)

۶۔ آسمانی کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں گناہگاروں کی صورت مسخ

ہو کر بندر اور سور کی شکل ہو گئی تھی اس پر یقین ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۸۷)

۷۔ گذشتہ زمانہ میں بعض لوگ کہہ گئے ہیں کہ ہر فرد کے گناہ کی سزا چند شکلیں

اختیار کرتی ہے، ہر زمانہ میں گناہ کی سزا اس کی حالت کے مطابق ہوتی ہے میں اس کی تائید

کرتا ہوں۔ (ایضاً)

۸۔ چراغ جلانا آفتاب کی شان کا اظہار کرنا ہے، آفتاب غروب ہونے کے بعد

چراغ نہ جلایا جائے تو کیا کیا جائے۔ (ایضاً)

۹۔ معدہ کو جانوروں کا گورستان بنانا مناسب نہیں۔ (ایضاً)

۱۰۔ قصاب، ماہی گیر اور جان مارنے والے سے لوگ نہ ملیں اور جو ملتا ہو اس

سے تاوان لیا جائے۔ (ایضاً ص ۱۸۹)

۱۱۔ بیگانہ افراد میں شادی کرنا پسندیدہ ہے۔

۱۲۔ فرماں روا کا دیدار خدائی عبادت ہے اسی لیے وہ ظل اللہ کہلاتا ہے، صاحب

سایہ کو سایہ بتاتا ہے، اس لیے فرماں روا کا دیدار خدا کی یاد کا سرمایہ ہے۔ (ایضاً ص ۱۹۰)

اوپر ابو الفضل نے کچھ لکھا ہے اس ظاہر ہے کہ اکبر اسلام کی پیروی کرنا محض تقلید

پرستی سمجھتا، اس تقلید کی اس نے مذمت کی اور عقل کو پایہ فراز عطا کیا، مشعل دلیل سے اپنے

دماغ کو یہ کہہ کر روشن کیا کہ دلیل کے ذریعہ ہی کسی بات کو ماننا انصاف ہے، اسی سے دل

کے قفل کی کنجی کھل سکتی ہے، اسی عقل کو بروئے کار لا کر وہ ہم زبان نفس قدسی ہو گیا اور اس کا

نور ولایت اپنا پر تو دکھانے لگا اس کی جادو نفسی اور سحر طرازی کا شور ہوا تو چشم بینا رکھنے والوں

نے اس کو جہان نفس کا پیشوا تسلیم کر لیا لیکن جو لوگ تقلید سے گرد آلود تھے اس کے مخالف

ہو گئے، مگر آگاہ دل دیدہ وروں نے اس کو امام وقت اور مجتہد روزگار قرار دیا جو اس نے اپنی

حقیقت پڑوسی سے منظور بھی کر لیا، اس سے بقول ابو الفضل تیرہ رائے رکھنے والوں کو دکھ

پہنچا اور وہ پرانی رسم کے بموجب یادہ گوئی کرنے لگے اور اس پر دعویٰ خدائی کی تہمت رکھی اور یہ مشہور کیا کہ وہ دین احمدی کو اچھا نہیں سمجھتا۔

اسی کے بعد اس نے خدا شناسی کے جذبہ میں حکم دیا کہ سال کے خاص خاص مہینوں میں چوہے نہ مارے جائیں، چیتے، خرگوش اور مچھلی کا شکار نہ ہو، بھیڑ اور مرغ ذبح نہ کیے جائیں وغیرہ اور جب اس نے روحانی رہنما بن کر رشد و ہدایت شروع کی تو آفتاب، آگ، چراغ کی پرستش کرنے لگا، تاسخ کا قائل ہو گیا، سوری حرمت کا قائل نہیں رہا، گوشت نہ کھانے کی تلقین کی، ختنہ اور تکلفین اور رشتہ داروں سے شادی کرنے کو فعل ناپسندیدہ قرار دیا۔

دین الہی تو اکبر کی زندگی میں مرنے لگا تھا، اس کو زندہ رکھنے کے لیے ابوالفضل جیسے ذہین مصاحب اور سحر طراز انشا پرداز کی ضرورت تھی، مگر ابوالفضل کا قتل اکبر کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا جس کے بعد اکبر کی پاک طینتی، خدا شناسی، حقیقت پر وہی، حق جوئی، صلح پسندی، ژرف نگاہی، جادو نفسی، مجتہدانہ گرہ کشائی، جہان معنی کی دیدہ وری، روحانی فیض گستری کی تاویل کرنے والا کوئی نہیں رہا، یہ مذہب تو ابوالفضل کے محض حسن تعلیل سے باقی تھا، وہ مرا تو یہ مذہب بھی اپنی موت مر گیا اور اگر پرائس کی تزک جہانگیری کے انگریزی ترجمہ کے بعض ٹکڑے کو قابل یقین سمجھا جائے تو اکبر نے اپنی زندگی ہی میں اپنے ذہن کے قبرستان میں اپنے نئے دین کو سپرد خاک کر دیا، وہ اس کو دفن نہ کرتا تو جہانگیر اور شاہ جہاں اس کا ذکر کسی نہ کسی سلسلہ میں ضرور کرتے مگر اس کی آئندہ نسل کی زبان پر کبھی اس نئے دین کا ذکر نہ آیا، اس دین سے پہلے کبیر داس نے وہی آواز بلند کی تھی جو اکبر نے کی، گو کبیر کی آواز بھی بہت دور تک نہ جاسکی پھر بھی کبیر پنتھیوں کی چھوٹی سی جماعت اب بھی ہندوستان میں باقی ہے لیکن دین الہی کے مقلدوں کا نام و نشان نہیں ملتا، البتہ تاریخوں میں اس مذہب پر محققانہ بحث جاری ہے، مسلمانوں نے تو دین الہی کو ملا عبد القادر کی تحریروں کی روشنی میں سمجھنے کی

کوشش کی اور اس کو ایک مذہبی مزخرفات سمجھ کر رد کر دیا، علمائے ہر زمانہ میں اس سے کراہت کا اظہار کیا، حضرت مجدد الف ثانی نے اس دینی بدعت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا تھا اس کو رفع کرنے کے لیے تجدیدی دعوت و عزیمت سے کام لیا جس کے بعد وہ مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیے جانے لگے، انھوں نے تو اکبر کی زندگی ہی میں ابوالفضل سے یہ کہہ کر اکبر کی مذہبی بدعتوں پر ضرب کاری لگائی کہ ”بادشاہ بے دین است، اعتبارے ندارد“۔ ان کے بعد تمام علمائے اس مذہبی بدعت کو گمراہی اور ضلالت قرار دے کر اس سے برأت ظاہر کی ہے۔

موجودہ دور کے علمائے بھی اس سے اپنی بے رغبتی کا اظہار کیا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں دین الہی کو ایک فتنہ کبریٰ قرار دیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہت ہی روشن خیال، روادار اور فراخ دل عالم تھے، انھوں نے ملا عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل دونوں کی تحریروں کو سامنے رکھ کر دین الہی پر بڑا ہی جامع تبصرہ لکھا ہے جو عالمانہ بھی ہے، ناقدانہ بھی اور غیر جانب دارانہ بھی، وہ لکھتے ہیں:

اکبر کی امارت کے محضر کا حال یہ ہے کہ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانہ میں دنیا پرست عالموں کی کثرت و طاقت نے ملک کے امن و سکون کو تہ و بالا کر رکھا تھا، علی الخصوص اہل اللہ اور ارباب حق پر انھوں نے اپنے غرور دنیا اور نشہ حکومت دریاست میں بڑے مظالم و شدائد کیے تھے جس کسی کو طلب دنیا سے مستغنی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سرگرم دیکھتے اپنی دنیا پرستیوں کا حریف سمجھ کر مخالف ہو جاتے اور کوئی نہ کوئی الزام تراش کر فتنہ و مصائب میں مبتلا کر دیتے، اکبر کے ابتدائی عہد تک یہی حال رہا، ان علمائے حکومت میں دو شخصوں نے بڑا عروج دنیاوی پایا تھا، مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدوران ہی لوگوں کے ظلم و تعصب کا ایک قاتل خاندان ملا مبارک کا بھی تھا اور ملا



موصوف کے تبحر علمی، فقر و استغنا اور بے باکانہ امر بالمعروف کی سرگرمیوں سے وہ سخت عاجز آگئے تھے، ایک عرصہ کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انہوں نے لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کسی طرح کم کیا جائے، چنانچہ حکمت و تحقیق جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں لیکن افسوس مرض کو دور کرنے کے لیے ایسا نسخہ تجویز کیا گیا جو آگے چل کر ایک دوسرے مرض کی تولید کا باعث ہو گیا، پہلے افراط تھی تو اب تفریط ہو گئی، پہلے تعصب و اوہام تھے تو اب ان کی جگہ الحاد و بے دینی نے نشوونما پائی اور تاریخ مذہب کے ہر گذشتہ دور کی طرح اس دور میں بھی افراط و تفریط کی دو جماعتیں پیدا ہو گئیں، پہلی جماعت دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی جو اپنی ہوا پرستی اور تعصب و جہالت سے اصل مذہب کو بدنام کر رہے تھے، دوسری جماعت ان کے مد مقابل مدعیان تحقیق جدید و اجتہاد فکر کی تھی، جنہوں نے حکمت و دانش مندی اور مذہب عقلی و طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی اور اہل حق و اقتصاد کا فریق ان دونوں سے الگ تھا وہ جس طرح پہلی جماعت کے تسبیح زور خرقتہ سالوس سے بیزار تھے، اسی طرح دوسری جماعت کے فریب عقل اور فتنہ دانش و آزادی سے۔

ازاں دعویٰ بہ شیخ و برہمن ماند کہ ہر ایک دادرے رامی پرستند

یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے، مذہب کے دوکان داروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے، نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدے میں رندان بے دیا، ارباب صدق و صفان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں ان کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ و ہم بت کدہ رہ ما برد رتم و صنم بر سر محراب شکستیم

عہد اکبری میں بھی ارباب حق و صفا کا جو گروہ تھا وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چوں کہ دربار شاہی پر بد بختانہ یکے بعد دیگرے ان ہی دو گروہوں کا تسلط تھا اس لیے ان کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، حضرت شیخ جمال الدین بھی ان ہی لوگوں میں تھے، خاندان ملا مبارک یعنی ابوالفضل فیضی نے مولویوں کا زور توڑنے کے لیے تدبیر کی، ۹۸۷ء میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا، مضمون یہ تھا کہ بادشاہ خلیفۃ الزمان اور امام عہد واجب الاطاعت ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسب ضروریات وقت اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے، اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی، فی الحقیقت خلیفۃ وقت ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے، اسی کے سدباب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی، مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا، اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا، نتیجہ یہ نکلتا اور نکلا کہ بادشاہ کی امامت و اجتہاد بے قیدی و الحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی، اس لیے ضروری تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں سخت تامل ہوا۔

لیکن حکومت کے زور کے آگے کس کی چلتی ہے، علمائے سونے اپنی بد اعمالیوں سے اپنا اثر پہلے ہی کھو دیا تھا، مجبوراً سب کو دستخط کرنا پڑے سب سے پہلے ان ہی گردن کشوں نے سر جھکا یا جن کی رگ گردن سب سے زیادہ موٹی تھی اور جن کی فصد کھولنے کے لیے یہ نشتر تیز ہوا تھا، یعنی ملا عبدالنبی اور مخدوم الملک نے پھر قاضی القضاة جلال الدین ملتانی اور شیخ عبدالنبی مفتی وغیرہ سب نے بلا چوں و چرا اپنی اپنی مہر میں مثبت کر دیں اور علمائے دربار میں کسی کو انکار و تامل کی جرأت نہ ہوئی۔

اللہ اللہ کیا انقلاب وقت ہے، یہ وہی مہر میں ہیں جو کبھی علمائے حق کی تکفیر و تھلیل کے فتوؤں پر مثبت ہوتی تھیں اور ان کے قتل و سلب کے فرامین کا دامن سیاہ کرتی تھیں، آج ایک ان پڑھ نوجوان کی امامت و اجتہاد کی تصدیق کر رہی ہیں تاکہ یہ مصدقہ امامت کل کو خود

انہی کے آگے آئے اور اپنے پہلے ہی جھونکے میں ان کی شیخ الاسلامی اور مذہبی فرماں روائی کا چراغ گل کر دے۔

یہ لپٹیں نہ ہوں قتل نصاب یہ ہے کہ ہم خود بد آموز قاتل ہوئے ہیں  
افسوس ہر عہد اور ہر دور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں علمائے سوہی کے ہاتھوں  
ہوئیں، وقت اور زمانے کی شکایت بے سود ہے۔

تا کے ملامت مژہ اشکبار من یک بار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش  
سچ یہ ہے کہ عہد اکبری کے تمام فتنہ و فساد کے اصلی ذمہ دار یہی علمائے عبیدالدین  
ہیں نہ کہ ابوالفضل فیضی، حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اس عہد کی نسبت اپنے  
مکاتب میں بار بار لکھتے ہیں:

”ہر فتورے کہ دریں زمانہ در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شوئی علماء سوء

است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اندا و لـ \_\_\_\_\_ ک حـ زب

الشیطن۔ الا ان حزب الشیطن هم الخاسرون“

اکبر نے تمام حاملین مذہب کا یہ حال دیکھا تو سرے سے مذہب ہی کو خیر باد  
کر دینا چاہا، خود ابوالفضل فیضی کو بھی ان ہی لوگوں نے اپنی ہوا پرستیوں اور ظلم و عدوان کے  
نمونے دکھلا کر اس طریقہ میں آنے کی دعوت دی تھی جس کی بے اعتدالیاں دیکھ دیکھ کر وہ خود  
متاسف ہوتے ہوں گے کہ مقصود کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا، انھوں نے علمائے سوء کے غرور  
و پندار کا بت توڑنے کے لیے ایک در سربت تیار کیا جس کا نام اکبر تھا لیکن آگے چل کر خود  
اسی بت کی پرستش ہو گئی۔ (تذکرہ ص ۲۳-۱۶)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی مشہور کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد چہارم  
میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کارناموں کا ذکر کے سلسلہ میں دین الہی کا بڑا فاضلانہ اور  
ناقدانہ تجزیہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ دین الہی میں توحید کے بجائے (عبادت آفتاب کی شکل

میں) شرک صریح، کواکب پرستی، ایمان بالغیب کے بجائے عقیدہ تناسخ تھا اور یہ مذہب زنجیر آتشیں بنا کر اس وقت کے اسلام کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔

(تاریخ دعوت و عزیمت ج ۲ ص ۱۰۷-۱۰۸)

مگر موجودہ دور کے بعض ہندو مورخین نے اپنی تحقیقی کاوشوں اور فکری حاشیہ آرائیوں سے اس کو سراہنے کی کوشش کی ہے، ان ہی میں پروفیسر مکھن لال چودھری سابق استاذ شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی ہیں جنہوں نے دین الہی پر پوری ایک کتاب لکھ دی ہے اور اس کو اسلامی تصوف سے تطبیق دے کر ایک قابل قبول مذہب ثابت کرنے میں ہر قسم کے دلائل پیش کیے ہیں اور اپنی تحقیقات کو باوقار اور مدلل بنانے کے لیے ہر قسم کی عربی اور فارسی کتابوں اور ماخذوں کا سہارا لیا ہے لیکن فارسی و عربی میں ان کے علم کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ غزنی کو گزنی (ص ۵۰) رمضان کو رمان (ص ۱۱) حبشی کو حبسی (ص ۵) شیرازی کو شیراجی (ص ۵۰) بخششی کو کبشی (ص ۵۵) وضو کو او جو (ص ۶۳) قربانی کو کربانی، جہاز کو جہاج (ص ۷۷) نکاح کو نکاح (ص ۷۹) یعقوب کو یاکوب (ص ۷۹) شرف الدین کو سرف الدین (ص ۱۹) گجرات کو گزرات، ملا دو پیازہ کو ملا پیاجا (ص ۸۳) وغیرہ وغیرہ لکھتے ہیں اور ان کی کتاب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ فکر، ذکر، نفس، اخلاق، مباح، سالک، ناسوت، ملکوت، جبروت، متولی کے معانی و مطالب سے بالکل ہی ناواقف ہیں لیکن ان تمام الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کر کے اپنی گہری علمیت کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر اسلامی عقائد کے متعلق اس رائے پر پہنچتے ہیں کہ:

کلام پاک میں ایسی آیتیں ہیں جس میں قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (ص ۱)

کلام پاک میں آفتاب کی تعریف کی گئی ہے اس لیے آفتاب اور دوسرے

سیاروں کی تعریف سے اکبر اسلام کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتا ہے۔ (ص ۶۰)

مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ کے خیال کے مطابق ختنہ اسلامی قانون کے

خلاف ہے۔ (۱۶۲)

محمد سیارہ زہرہ کی تعظیم کرتے تھے اس لیے جمعہ کو مبارک دن قرار دیا۔ (۹۲)

پھر ہندوستان کی تاریخ میں اس کی تحقیقات یہ ہیں:

سکندر لودھی پندرہ ہزار ہندوؤں کو ایک روز قتل کر کے اسلام سے اپنی محبت کا

ثبوت دیتا تھا۔ (ص ۱)

محمود غزنوی نے مندروں کی مورتیاں منہدم کر کے ان میں اسلام قائم کر دیا۔ (ص ۳)

تیمور نے سات لاکھ انسانوں کو قتل اس لیے کیا کہ کافروں کو مومن بنائے۔ (ص ۱)

وغیرہ وغیرہ اور پھر یکا یک ایک باب میں اپنی سائنٹفک تحقیق کے ذریعہ سے اپنے ناظرین کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اکبر کے دین الہی کی بنیاد حسب ذیل احکام پر تھی:

۱۔ جو دو کرم ۲۔ عفو از بدکار و دفع غضب بہ حلم ۳۔ تعفف از شہوات دنیاویہ ۴۔ فکر

اخلاص از بند عالم کون و فساد و اذخار اسباب، التذ اذ آں عالم دائم الوجود ۵۔ ریاضت عقل و ادب

در عواقب امور ۶۔ قوت تصرف عقل در طلب عالیات امور ۷۔ صوت نرم و لین قول و طیب کلام

باہر مردے ۸۔ حسن معاشرت باخوان بانا کہ اختیار ایشاں بر اختیار خویش مقدم دارد ۹۔ اعراض

از خلق بہ کلی و توجہ بالکلیہ بہ حق ۱۰۔ بذل روح از شوق بہ حق و وصول بہ حضرت کریم۔

ہمارے ناظرین اکبر نامہ اور منتخب التواریخ جیسی معاصر تاریخوں کی ساری تحریریں

گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں، ان میں کہیں یہ ساری باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، مکھن لال

چودھری کا جدت آفریں ذہن کہیں نہ کہیں سے یہ انمول جواہرات ڈھونڈ کر لایا، انھوں نے یہ

جواہرات دبستان المذاہب کی کان سے نکالے ہیں، اس کتاب میں زیادہ تر مذاہب کے

عقائد باطلہ کی تفصیلات ہیں، اس کے مصنف کے صحیح نام تک کا بھی آج تک پتہ نہیں چلا ہے

وہ کوئی مستند کتاب نہیں سمجھی جاتی ہے پھر بھی اس کتاب کا سہارا لے کر مکھن لال چودھری نے

تین سو بیس صفحے کی کتاب لکھ ڈالی اور خوش تھے کہ دین الہی کو ثابت کر کے ہندوستان کی تاریخ

میں اب ہلچل ڈال دیں گے، اگر دین الہی کے واقعی یہی احکام ہوتے تو کسی کو کیا اختلاف ہو سکتا تھا مگر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے فارسی زبان سے ان کی لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے، دبستان المذاہب میں ”دین الہی“ کے عنوان سے جہاں اور کچھ لکھا گیا ہے وہاں اکبر کے عبادت خانہ کے مباحث کا بھی ذکر آیا ہے جس میں مسلمان، نصرانی اور یہودی تین تین حکیم فاضل موجود تھے، ایک حکیم ان کو مخاطب کر کے ایک لمبی تقریر کرتا ہے، وہ انبیاء کی تعلیمات پر اعتقاد نہیں رکھتا ہے وہ کہنا چاہتا ہے:

”خداوند تعالیٰ کی شناخت عقل کے فرمان کی متابعت ہی سے ہو سکتی ہے جو خود ایک نبی کامل ہے جس کو صاحب ناموس اکبر (یعنی حضرت جبریلؑ) کے ذریعہ القا ہوتی رہتی ہے“ اسی کو ثابت اس طرح کرتا ہے:

”اور جو چیز عقل کی وسعت میں نہ سمائے وہ پوشیدہ رہے گی اس کا اقرار کرنا اہلی ہے، گرچہ عقلا کی باتیں نبی کی کتاب اور حدیث سے زیادہ بہتر ہوتی ہیں، عام طور سے یہ اعتقاد چلا آ رہا ہے کہ انبیاء حق پر ہوتے ہیں پھر جو بھی نبی کا دعویٰ کرے وہ حق پر سمجھا جائے گا لیکن بے وقوف لوگ ہی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عقل سے انبیاء کی عقل فوقیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے مذاہب میں بہت سے فرقے ہیں اور ان کے گفتار و کردار میں بھی بہت تضاد ہیں، جب وہ ایک نبی کو مان لیتے ہیں تو خدا شناسی اور حق پرستی میں اسی کی اقتدا کرتے ہیں لیکن کچھ دنوں کے بعد دوسرا نبی آتا ہے تو خدا پرستی اور حق پرستی میں وہ اور احکام دیتا ہے اور لوگ پہلے نبی کو دروغ گو سمجھنے لگتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ ہر دور میں لوگوں کے لیے زمانہ کے مطابق شریعت ہوتی ہے لیکن حق شناسی میں اختلاف نہیں ہوتا ہے، چاروں آسمانی کتابوں میں بہت اختلاف ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ شروع میں خدا نے اپنے کو خود نہیں پہچانا تھا، اس لیے پہلی کتاب میں اپنے متعلق سوچنے میں خطا کی تھی، دوسری کتاب میں کوئی اور چیز کہہ دی، اسی طرح تیسری اور چوتھی صدی میں کچھ اور باتیں ہیں لیکن

اسی لیے عقل والوں کے نزدیک شناخت حق کی رستگاری نبی کامل صاحب ناموس اکبر یعنی عقل فرمان کی متابعت میں ہے، عمل ممنوعہ، شہوات و لذات، جانداروں کے فعل، دوسرے کے مال کے استحصال، زنا، جھوٹ، تہمت تراشی، ظلم، ایذا رسانی، بیہودہ گوئی، آخرت کے انکار سے اللہ تعالیٰ کی شناخت محرومی وغیرہ سے بچنے کے لیے ان دس چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ جو دو کرم ۲۔ برے کام کرنے والوں کو معافی دینا اور غصہ کو اپنے حلم سے فرد کرنا  
 ۳۔ دنیا کی بری خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھنا ۴۔ اس کون و فساد کی دنیا سے چھٹکارا حاصل کر کے اس دائم الوجود دنیا کے لذائذ حاصل کرنے کی فکر کرتے رہنا ۵۔ اپنے اعمال کے نتائج کو عقل پر پرکھنا، ان سے سبق سیکھنا اور ان پر غور کرتے رہنا ۶۔ بلند کام کو انجام دینے کی خاطر عقل کو تصرف میں لاتے رہنا ۷۔ ہر شخص سے گفتگو میں نرمی لیتا اور خوش گواری سے پیش آنا ۸۔ لوگوں کے حسن معاشرت کے ساتھ برتاؤ کرنا کہ اپنی خواہشوں کو ان کی خواہشوں پر مقدم رکھا جائے ۹۔ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر خدا کی طرف بالکل توجہ رکھنا ۱۰۔ روح کو خدا کے لیے اس طرح وقف کر دینا کہ یہ صرف اسی کی محبت اور وصل کے لیے باقی رہے اور جب تک یہ جسم میں ہے اسی کی غلام ہے اور اسی سے ملنے کے لیے باقی ہے، یہاں تک کہ جسم سے روح جاتی رہے وہ سب سے اچھے لوگ ہیں جو قلیل غذا پر اکتفا کرتے ہیں اور اس دنیائے فانی سے اجتناب کرتے ہیں کھانے، پینے اور ٹھننے، شادی بیاہ کی لذتوں سے دور رہتے ہیں، ادنیٰ تر وہ قوم ہے جو جنسی لذت اور کھانے پینے کو اپنے حق کے مطابق حلال قرار دے دیتی ہے، یہ ساری باتیں مشکل ہیں اس لیے نبی کامل اور رسول اکبر یعنی عقل نے کہا ہے کہ جو لوگ انبیاء کے بنائے ہوئے قوانین کو مانتے ہیں وہ شیطان کے نفس حیوانی کے تابع ہیں، کیوں کہ انبیاء خود شہوت، غصہ، کھانے پینے کے لذائذ، اچھے لباس اور عورتوں کے جمال میں مبتلا رہے وہ بنی نوع انسان پر ان کو کافر کہہ کر ظلم کرتے رہے بلکہ اس ظلم کو پسند کرتے

رہے جو علما، انبیا کی متابعت کرتے ہیں وہ دنیا کو حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، حالاں کہ وہ ان کے جھوٹ سے واقف ہو کر ان کے منکر ہوتے ہیں لیکن فرصت کے اوقات میں وقت کی مناسبت اور تواضع کے لحاظ سے طرح طرح کے قوانین بناتے رہتے ہیں۔

اس فاضل حکیم کا جواب اس انجمن میں کسی سے نہ ہوسکا، وہ حکیم جو دنیا کی فکروں سے تجرّد حاصل کر چکا تھا، باہر چلا گیا جس کے بعد خلیفۃ اللہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اکبر کو یہاں خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے وہ اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ناگزیر ہے اور جو چیز اس کے قریب ہے اس کی تعریف بھی ضروری ہے کسی انسان کا رتبہ ستاروں کے برابر نہیں کیوں کہ انسان کو ستاروں کی بلندی حاصل نہیں سالک کو ایزد متعال کے علاوہ کسی اور سے غرض نہیں، وہ کھاتا ہے اس لیے کہ وہ خدا کی بندگی کر سکے وہ نوکری اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنی بندگی میں عاجز اور محتاج بن کر نہ رہے، وہ عورت کی خواہش اس لیے کرتا ہے کہ اس سے صالح اور خدا پرست اولاد پیدا ہو، وہ روشنی اور ستاروں کی تعظیم اس لیے کرتا ہے کہ ان کو حق تعالیٰ سے قربت حاصل ہے، وہ سوتا اس لیے ہے کہ اس کی روح عالم علوی کی سیر کو ہے اس طرح سالک ہر وقت حق کی بندگی اور اطاعت میں مشغول رہتا ہے کسی لمحہ نماز سے غافل نہیں رہتا ہے، جانداروں کو تکلیف دینے سے پرہیز کرتا ہے، حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی عزت کرتا ہے بلا ضرورت درخت، گھاس اور سبزہ کو نہیں کاٹتا ہے، زمین کے ہر حصہ کو ناپاک نہیں کرتا ہے، اسی حصہ کو ناپاک کرتا ہے جو ناپاکی کے لیے مخصوص ہو گئی ہے، وہ آگ اور پانی کو کسی ناپاک جگہ پر نہیں پھینکتا ہے، ستاروں پر درود بھیجتا ہے وہ کم بولنے، کم کھانے اور کم سونے کی عادت ڈالتا ہے ان کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی مشغولتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اپنے حواس ظاہر کو اپنی انگلیوں سے بند کر دیتا اور آفتاب کا تصور کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

(دبستان المذاہب ص ۳۰۳ ممبئی ایڈیشن ۲۰۲۰ء کابل ایڈیشن)



فاضل حکیم نے جو مذکورہ بالا تقریر کی اس میں پروفیسر مکھن لال چودھری نے ”اکبر“ کا لفظ دیکھ کر بس یہ فیصلہ کر لیا کہ اکبر وہی اکبر ہے جس نے دین الہی قائم کیا تھا بس دین الہی کے بنیادی اصولوں پر پوری کتاب تیار کر لی اور اسی کو سائنٹفک تحقیق قرار دے کر اس مذہب کو عین اسلامی تصوف کے مطابق ثابت کر دیا۔

راقم نے اس کتاب پر پہلے تو ۳/۳ نومبر ۱۹۴۵ء کو اسٹار آف انڈیا کلکتہ میں ایک طویل ریویو لکھا جس سے کلکتہ میں پروفیسر کی علم دانی کے خلاف شورش ہوئی مگر وہ اپنے علم کی کم مائیگی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اس لیے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا جس پر راقم نے لاہور کے انگریزی رسالہ اسلامک لٹریچر میں بھی ایک طویل ریویو شائع کیا اور اس کتاب کو ایک لٹریچر اسکینڈل قرار دیا۔

استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا مطالعہ کیا تو دسمبر ۱۹۴۴ء کے معارف کے شذرات میں یہ تحریر فرمایا:

”کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ تحقیقات علمیہ کے تحت اکبر کے دین الہی پر ایک مقالہ ایک بنگالی طالب تحقیق نے لکھ کر پیش کیا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ اکبر کا یہ مذہب آیات و احادیث کے مطابق اور عین اسلام تھا، یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے مستند سمجھا گیا اور مقالہ نویس کو اسلامی علوم میں کمال مہارت کی داد دی گئی اور کہتے ہیں کہ اس کے مصنف کو یونیورسٹی کے محققین علوم اسلامیہ کی نگاہ میں اس لائق سمجھا گیا کہ اس کو مزید تعلیم کے لیے جامع ازہر مصر بھیجا جائے اور وہاں سے واپسی پر اس کو اسلامی چیر پیش کی جائے۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہوتا تو بہت امید افزا تھا کیوں کہ اس سے اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مذہبی علوم سے اس درجہ واقف ہو رہے ہیں کہ ایک دوسرے کے اہم مذہبی مسائل میں ماہرانہ رائے دے سکتے

ہیں مگر افسوس کہ واقعہ ایسا نہیں، مصنف مذکور کو جامع از ہر تو کچا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی داخلہ مشکل معلوم ہوتا ہے جس کو ”وضو“ اور ”اوجو“ میں تمیز نہ ہو وہ مسائل دین اسلام میں تحقیق کی داد دینا چاہے تو کیسے تعجب کی بات ہے۔

مقالہ مذکور ناواقفیتوں کا مجموعہ اور غلط قیاسات و استدالات کی منطق سے معمور ہے، دبستان المذاہب کے مجہول الاسم جیسے مصنف کے بیان سے دین الہی کے جو اصول بتائے گئے ہیں وہ تمام فارسی عبارت کی نا فہمی پر مبنی ہے، دین الہی کے اصول اور رسوم کو ابوالفضل نے تفصیل سے لکھا ہے، ان رسوم کو سامنے رکھ کر اس کو دین کہنا دین سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔

بہر حال سنا ہے کہ بنگال کے علمی و تعلیمی حلقہ میں اس کو یہ سند قبول حاصل ہوئی کہ مقالہ نویس صاحب کا نام یونیورسٹی مذکور میں اسلامی تاریخ کا جو نیا شعبہ قائم ہوا ہے اس کی صدارت کے لیے لیا جا رہا ہے، ہم کو علم نہیں کہ اس مقالہ کے ممتحنین میں کون کون اہل کمال شامل تھے تاہم اتنا یقینی معلوم ہوتا ہے کہ علم کی خدمت تعلقات اور مصلحتوں کو تقدم کا حق بخشا گیا ہے، علم کے دین الہی میں اس سے بڑا گناہ کوئی دوسرا نہیں۔

مصنف نے کتاب کے آغاز میں آل تیمور کے مذہبی حالات کا تیمور کے وقت سے لے کر اکبر تک جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ تیمور اور آل تیمور پورے مسلمان نہ تھے بلکہ صوفیانہ ارتقا طے کرتے آئے تھے جس کی آخری سیڑھی اکبر کا یہ دین الہی ہے، عمل کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ کوئی کامل مسلمان مشکل سے ثابت ہو سکتا ہے مگر عقیدہ کے لحاظ سے آل تیمور کو ہمیشہ اس لیے بد عقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ اکبر کی بد عقیدگی کے لیے گنجائش نکلے، عذر گناہ بدتر از گناہ کی بہترین مثال ہے۔

ہم کو خوشی ہے کہ دارالمصنفین کے ایک رفیق سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے اس کتاب پر انگریزی میں جو ریویو لکھا وہ کلکتہ اور دلی کے اسلامی انگریزی اخبارات میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اصل انگریزی ریویو اشار آف انڈیا کلکتہ میں چھپا تھا اور اخبار مذکور نے اس پر لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر اس کی تحسین کی، اخبار ڈان دہلی نے بھی اس ریویو کو اپنے کالموں میں نقل کیا۔ اس کتاب کی غلطیوں سے یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی کے مواد فاسد سے جو چیز تیار کی گئی ہے وہ کس قدر زہرناک ہے اسلام کا تصوف وہ نہیں جو داراشکوہ وغیرہ کی تصنیفات میں ہے بلکہ وہ ہے جو سلطان نظام الدین اولیا، مخدوم الملک بہاری، مجدد الف ثانی اور دیگر ائمہ اسلام کی تصنیفات میں ہے پر جوگ آمیز تصوف کی راہ سے ہندو مسلمانوں کو ملانے کی کوشش نہ ہندوؤں میں مقبول ہو سکتی ہے اور نہ مسلمانوں میں، اس کا تجربہ اکبر سے لے کر اصغر نے کر لیا مگر نتیجہ ناقابل قبول رہا۔

اسی قسم کی ایک اور کوشش یوپی ہسٹاریکل جرنل میں کی گئی ہے اس میں اکبر کے اس محضر نامہ پر جس کی رو سے اس کے وقت کے چند ”روشن خیال“ علما نے اس کو امام بنا کر مختلف فیہ مذاہب میں ترجیح و اجتہاد کا حق دیا تھا، تحقیق کی گئی ہے اس کے لکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں جو اہل سنت سے باخبر نہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں، مضمون نگار کی بنیاد ایک معمولی غلط فہمی پر ہے، مادری کی الاحکام السلطانیہ میں خلیفہ و امام کے انتخاب کے لیے جس علم کی قید ہے اس سے مقصود دین، اصول اور مسائل دین کا علم اور عمل ہے، ظاہر ہے کہ اکبر اس علم کے ظاہر اور باطن دونوں سے کورے تھے اس لیے انتخاب کے طور نہ خلیفہ ہو سکتے تھے، نہ امام، نہ مجتہد، نہ مرجع، البتہ وراثت کے دعویٰ اور تلوار کے

زور سے وہ سب کچھ بنائے جاسکتے تھے اور بنائے گئے تو اس کے لیے سرے سے علم ہی کی ضرورت نہیں، صرف تاج و تخت کی ضرورت ہے۔

صاحب مضمون کو شاید کسی وجہ سے دھوکا ہوا کہ لفظ امام اہل سنت میں بھی ایک ہی معنی رکھتا ہے لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے، امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہیں، اس کا اطلاق اہل سنت میں پیشوائے دینی، پیشوائے علمی، پیشوائے سیاسی بلکہ پیشوائے کفر تک پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: وَقَاتِلُوا آئِمَّةَ الْكُفْرِ اس لیے جس امام کو اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہے وہ وہ امام ہے جو پیشوائے علوم دین ہے نہ کہ ہر اس شخص کو جو کسی اور معنی کے لحاظ سے امام ہو، البتہ اگر کسی کی ذات میں اتفاق سے امامت علمی و امامت سیاسی مجتمع ہو جائیں تو بے شبہ اس کو اس کی اہلیت کے مطابق اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہوگا، جیسے خلفائے اربعہ اور خلفیہ عمر بن العزیز یا کوئی اور ایسا ہوا ہو یا ہو۔

اس سلسلہ میں صرف ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ جس مسئلہ میں فقہاء میں اختلاف ہو اور ہر ایک کے پاس ان کے اپنے دلائل ہوں ان میں کسی زمانہ میں کوئی امام سیاسی (سلطان) مسلمانوں کی کسی خاص ضروری مصلحت کی بنا پر جس کو علمائے وقت بھی مصلحت سمجھیں، کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے کوئی حکم دے تو وہ ہنگامی طور سے اس خاص مصلحت کے تحت میں نافذ العمل ہو سکتا ہے مگر یہ ایک جزئی اختیار ہے جس سے محضر نامہ کے مضمون کو تعلق نہیں اور نہ اس کے لیے اس شد و مد سے محضر نامہ تیار کرنے کی ضرورت تھی، یہ اختیار تو محضر نامہ کے بغیر آج بھی ہر اسلامی ریاست کے امیر کو حاصل ہے۔

اکبر کے ان ہی مسلمان امرانے اس مصنوعی مذہب سے دلچسپی لی جو اس کی مزاج داری کر کے ذاتی فوائد اٹھانا چاہتے تھے مگر دربار کے ایسے غیرت مند، حق گو اور جری امرابھی

تھے جن کو اکبر نے اس نئے دین کی ترغیب دی تو انہوں نے اس کے مطالبہ کو رد کر دیا، ان ہی میں قطب الدین اور شہباز خاں تھے، شہباز خاں نے تو اکبر سے بڑی جرأت کے ساتھ کہا کہ شاہان ولایت اور خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے، وہ سب بہر حال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ یہ تقلیدی ہو یا کچھ اور، اکبر نے اس پر چڑھ کر کہا کہ تو روم کے فرماں روا کی خاطر میرے ساتھ اس درستی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح وہاں اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے تاکہ تجھ کو یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز اور مرتبہ حاصل کرے مگر شہباز خاں پر اکبر کے اس غصہ کا کوئی اثر نہیں پڑا، ایک روز دربار میں پیر بر نے اکبر کی خوشامد میں اسلام پر طنز کیا تو شہباز خاں نے اس کو گالی دے کر کہا: ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے، اکبر نے اس پر اپنی برہمی کا اظہار کیا شہباز خاں اور دوسرے امرا کو مخاطب کر کے کہا چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منہ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے، دربار میں اس مذہب سے یہ بد مزگی جاری تھی تو عوام میں بے چینی تھی جس سے فائدہ اٹھا کر جون پور کے ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف بغاوت اور خروج کا فتویٰ دے دیا جس کے بعد محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں قرنخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امرا تلواریں کھینچ کر بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بعض مقامات پر سخت لڑائیاں لڑیں، اکبر نے اپنی طاقت سے ان کو کچل دیا، ملا محمد یزدی کو جونپور سے طلب کر کے راستہ میں ایک دریا میں غرق کر دیا، اسی طرح اپنے مخالف علماء، مشائخ اور فقرا کو جلا وطن کیا اپنے بعض ایسے مخالفین کو گھوڑے کے تباولے میں قندھار جلا وطن کر دیا، دربار کے حکیم الملک اس نئے مذہب کے پادری ابوالفضل کو چڑھ کر فضلہ کہا کرتا تو اکبر نے اس کو مکہ معظمہ بھیج کر اخراج کر دیا۔ (بدایونی ج ۲ ص ۲۹۹-۲۷۶)

اس زمانہ کے ہندو منصب داروں نے بھی اس مذہب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا،

راجہ مان سنگھ اکبر کے جاں نثاروں میں تھا، اکبر نے جب اس کو اپنے نئے مذہب میں داخل

ہونے کی دعوت دی تو اس سچے راجپوت سپاہی نے جواب دیا کہ اگر مریدی سے مراد جان نثاری ہے تو اس کو آپ آزما چکے ہیں کہ آپ کے لیے ہمیشہ جان ہتھیلی پر رکھی ہے، اس کے بعد مزید آزمائش کی ضرورت نہیں اور اگر مذہبی مریدی مراد ہے تو میں ہندو ہوں، فرمائیے مسلمان ہو جاؤں اور کوئی راستہ تو نہیں جانتا (بدایونی ج ۲) مان سنگھ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص مذہب میں سچا ہو گا وہی وفاداری اور اخلاص میں پورا ترے گا کیوں کہ ہر مذہب کی بنیاد وفا اور اخلاص ہے اگر اہل مذہب میں اخلاص نہ ہو تو یہ مذہب کا قصور نہیں بلکہ بد مذہبوں کا قصور ہے، ہندو امر میں راجہ پیر بر کے علاوہ کسی اور نے اکبر کے مذہب کو قبول نہیں کیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ جس مذہب کو اکبر کے زمانہ کے ہندوؤں نے رد کیا تھا اس کو مکھن لال چودھری کے علاوہ بعض ہندو مورخین کس نظر سے دیکھتے ہیں، ڈاکٹر نند لال چٹرجی جنوری ۱۹۵۵ء کے رسالہ انڈیا اینڈ وائشین کلچر میں لکھتے ہیں:

”اکبر کے مذہبی رجحانات سے اس کی زندگی ہی میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی ورنسٹ اسمتھ نے کہا ہے کہ اکبر کا دین الہی اس کی حماقتوں کی یادگار ہے لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے، دین الہی میں اس کی وہ سرگرمی نظر آتی ہے جو اس میں مختلف مذہبوں کے مقابلہ اور موازنہ کے بعد پیدا ہوئی، اکبر نے کوئی عبادت گاہ قائم نہیں کی وہ مذہب میں ایک روادار نہ نقطہ نظر پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ دل و دماغ کی ایسی آزادی پسند کرتا تھا جس میں تنگ نظری، تشدد اور تعصب مطلق نہ ہو، دین الہی کوئی مذہب نہ تھا یہ تصوف کی ایک شکل تھی جس کو اس کے معتمد دوستوں اور درباریوں نے قبول کر لیا تھا اور جب کہ مذہبی پیشواؤں کا استیلا تھا، دین الہی کو ایک فیاضانہ اور روادارانہ نظام تصوف سمجھنا چاہیے۔“

”اکبر نے ۱۵۷۵ء میں عبادت خانہ قائم کیا اس میں مختلف مذاہب کا مطالعہ شروع ہوا اس روادارانہ رجحان سے طرح طرح کے باہمی مناقشے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں لیکن اکبر نے اپنی روش نہیں چھوڑی، وہ اندرونی طور پر صوفی منش تھا وہ مذہب کی روح

کو اس طرح ظواہر سے وابستہ کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس نے محسوس کیا کہ مذہب کے ظاہری اختلافات کے پیچھے ایک روحانی وحدت ہے اس نے ہندوستان کے مختلف اجزا سے اپنی حکومت میں وحدت پیدا کر دی تھی، اس جذبہ کے تحت اس نے محسوس کیا کہ مختلف عقائد کے پیچھے خدا کی ذات واحد ہے اس کا یہ رجحان ۱۵۸۲ء میں دین الہی کی شکل میں نمودار ہوا جو مختلف عقائد میں وحدت پیدا کرنا چاہتا تھا وہ مذہبی خلیفہ بھی بن گیا، اس میں اس کی نیت نیک تھی لیکن اس پر طرح طرح کے الزامات عاید کیے جاتے ہیں جو کوئی اس کی نیت میں ذاتی ترفع یا سیاسی عیاری کو دخل دینا چاہتا ہے وہ اس کے مذہبی رجحانات کو غلط طریقہ پر سمجھتا ہے۔

”اکبر نے مذہب میں نہ صرف ذہنی انجویہ پن کی وجہ سے دلچسپی لی بلکہ اس کے داخلی رجحانات بھی تھے وہ اپنے بچپن سے خدا اور بندہ کے تعلقات کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتا تھا، فلسفہ کی طرف اس کی توجہ برابر رہی اگر اس نے مذہب میں اصلاح کی تو اس کے اسباب اس کی سیاسی فریب کاری کے بجائے اس کے روحانی تخیلات تھے، اس نے ہندو مسلمان کی تفریق مٹانی چاہی تو اس کے اس مقصد کے پیچھے سیاسی اسباب سے زیادہ روحانی اثرات تھے اس نے ہندوؤں، پارسیوں، جینیوں اور عیسائیوں سے جو تعلقات رکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصروں سے زیادہ مذہبی مسائل میں گہری دلچسپی لیا کرتا تھا۔

”اکبر کا دین الہی ناکام رہا کیوں کہ اس قسم کا تصوف اس زمانہ کے لحاظ سے بہت آگے تھا، فیاضانہ رواداری کا زمانہ نہ تھا، تعصب چھایا ہوا تھا اس لیے اس کی مجتہدانہ باتیں غلط سمجھی گئیں، اکبر کو شاید اس کے خوشامدی اور ابن الوقت درباریوں نے بھی گمراہ کیا، غرض یہ کہ اس زمانہ کے سیاسی حالات ایسے نہ تھے کہ اکبر جو مذہبی سنگم قائم کرنا چاہتا تھا وہ مقبول ہوتا اس لیے اس کی رواداری سے کوئی خوش نہ ہوا اور یہ ناکام ہو کر رہ گئی۔“

پروفیسر کالکار نجن قانون گونے بھی دین الہی کے متعلق اپنی رائے دی جس کو بہت ہی متوازن کہا جاسکتا ہے، اس سے مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو بھی اتفاق ہوگا وہ اپنی

مشہور کتاب ”شیر شاہ“ میں لکھتے ہیں:

۱۔ اکبر نے اپنے تخیلات کا برا استعمال کیا اگر وہ غلط قدم نہ اٹھاتا تو ہندوستان کی قومیت سترہویں صدی ہی میں پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی، اگر اکبر نے جزیہ لینا بند کر دیا ہوتا، ذبیحہ گاؤں کو روادیا ہوتا یا اپنے نظام حکومت ہندوؤں کو ایک حد تک شریک کر لیا ہوتا یا سنسکرت زبان کی سرپرستی میں لگا رہتا تو یہاں تک کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن اس نے ہندوؤں کے فلسفہ اور مذہب کے ساتھ شغف کا اظہار کرنا شروع کیا جو تدبر کے سراسر خلاف تھا اگر اس شغف کا اظہار اس نے نہ کیا ہوتا تو بلاشبہ وہ دنیا کا بہت بڑا مدبر اور معمار ہوتا لیکن اس کے عجیب و غریب خیالات نے اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر بنا دیا، ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمراں بھی رہا اور یہی خیالات اس کی اسکیم کی تباہی کا باعث بنے اس نے کوئی متحدہ قوم نہیں بنائی بلکہ اس کی اسکیم سے ایسے چند مکار مسلمان اور غلامانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لیے اللہ اپ نشد لکھا کرتے تھے پھر ان کی اولاد میں بھی کچھ ایسے افراد ضرور پیدا ہوئے جو دہلی کے بادشاہ کا درشن کیے بغیر صبح کو پانی نہ پیتے تھے خواہ یہ بادشاہ اورنگ زیب ہی کیوں نہ ہوتا، اکبر نے اسلام کے ساتھ نا انصافی کی اس کو خواہ مخواہ رسوا کیا جس کے لیے تاریخ اس کو معاف نہیں کر سکتی، اس نے جو کچھ کیا ریاست کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ایک وہم کو پورا کرنے کے لیے کیا اس کی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق کا مرکز سمجھنے میں بالکل قاصر رہے، ہندو تو اس کی جانب ضرور مائل ہوئے لیکن مسلمانوں کی رغبت اس سے جاتی رہی، اکبر کا اسلام سے انحراف اس کی غیر معمولی ذہانت کا اچھا نمونہ نہ تھا، اس کو اپنی نجی زندگی میں سچا مسلمان ہونا چاہیے تھا، اگر وہ واقعی ہندو مسلمان کے تعلقات کی خوش گواری اور پاس داری کا خواہاں تھا تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہیے تھا لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بن جاتا تو مسلمان اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے پھر وہ



جو کچھ کہتا اس کو ماننے میں ان کو تامل نہ ہوتا، اس نے ہندوؤں کی حمایت میں جو قوانین بنائے ان میں مسلمانوں کو نیت کا اخلاص نظر نہیں آیا بلکہ اس کو اسلام کا غدار سمجھنے لگے، اس کا رد عمل یہ ہوا کہ وہ اسلام کی فلاح اسی میں سمجھنے لگے کہ گائے کا گوشت کھائیں اور ہندوؤں کی ہر چیز سے نفرت کریں، یہیں سے ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہو گیا اگر اکبر کا جانشین دارا ہوتا تو خاندان بابری ہندوستان سے ایک بار پھر در بدر کر دیا جاتا، اکبر کے مرنے کے بعد اس کی پالیسی کا رد عمل بالآخر اورنگ زیب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (ص ۴۲۴-۴۲۲)

دین الہی کا جو تجزیہ معاصر اور بعد کے ارباب نظر کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس کے بعد ہمارے ناظرین خود ایک نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اکبر کی یہ جدت اور بدعت کہاں تک درست اور مناسب تھی، یہ محض اس کی ایک ذہنی اور سیاسی عیاشی تھی جو ابوالفضل اور فیضی کی بگڑی ہوئی ذہانت کی بدولت بروئے کار آئی لیکن یہ مذہب اس کے ساتھ ہی مر گیا بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ اپنی آخری زندگی میں اس سے تائب بھی ہو گیا تھا، آثار الامرا جلد دوم، ص ۶۰۶ میں ہے:

جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ ”چوں کہ شیخ ابوالفضل نے میرے والد کو اس بات کا یقین دلادیا تھا کہ جناب ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم بے انتہا فصیح تھے، قرآن ان ہی کا کلام ہے پس دکن سے آتے وقت میں نے نرسنگھ دیو سے کہا کہ اس کو قتل کر دے اس کے بعد میرے والد نے یہ اعتقاد چھوڑ دیا۔“

مسٹر بیورج نے آثار الامرا جلد اول کے اس انگریزی ترجمہ میں یہ حاشیہ لکھا ہے کہ جہانگیر کا یہ بیان اس کی اس تزک کے انگریزی ترجمہ میں موجود ہے جو پرائس کا کیا ہوا ہے، راقم نے پرائس کے ترجمہ کو دیکھا تو اس میں جو کچھ ہے اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

میں یہاں پر اس کا ذکر کروں گا کہ میں نے ابوالفضل کے لڑکے شیخ عبدالرحمن کو دو ہزاری منصب دے کر اس کا مرتبہ بلند کیا گرچہ اس کے باپ ابوالفضل کو میں ایک

بد عقیدہ انسان کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا، میرے والد کی حکومت کے آخری زمانے میں اس نے اپنے ان اثرات سے فائدہ اٹھایا جو اس نے کسی طرح حاصل کر لیے تھے اس نے اپنے آقا کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ نبوت ختم المرسلینؑ کو جن پر میری جیسی ہزاروں جانیں قربان ہو جائیں تو ذکر کے لائق نہیں، اس سے زیادہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ایک عرب کی غیر معمولی فصیح البیانی کا نتیجہ ہے اور قرآن کی جو آیتیں مقدس سمجھی جاتی ہیں وہ جعلی کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں اور محمد ﷺ کی ایجاد کردہ ہیں ان ہی اسباب کی بنا پر میں اس آدمی کو کام میں لایا جس نے اس کو قتل کیا، میں نے اپنے پیغمبرؐ کے اسم مبارک کا سہارا لیا اور یہ اعلان کیا کہ اسی کے سہارے تخت کے لیے میری راہ ہموار ہو جائے گی، مجھ کو یہ مجبوراً لکھنا پڑتا ہے کہ میرے والد نے اپنی اس ناراضگی کی وجہ سے میرے لڑکے کے خسرو کو مجھ پر ترجیح دی، اپنی عنایتوں سے اس کا رتبہ بڑھایا اور یہ کہا کہ خسرو ہی کو بادشاہ ہونا چاہیے لیکن شیخ سعدی بہت پہلے کہہ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو ختم کر دیتا ہے جس کو وہ ختم کرنا چاہتا ہے، چاہے ملحد اپنے کسی طرح ڈھانک کر کیوں نہ رکھے (۱) آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دکھایا، ابوالفضل کی موت کے بعد میرے والد کے عقائد دوسرے ہو گئے اور وہ صحیح راستہ پر آ کر ایک راسخ مومن ہو گئے۔ (۱۹۰۴ء ایڈیشن کلکتہ ص ۵۶-۵۵)

پرائس نے جس نسخہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اس کو جعلی قرار دیا گیا ہے مگر آثار الامرا کے مصنف نے کم از کم اس بیان کو صحیح قرار دے کر اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اس کی تصدیق بعض عیسائی پادریوں کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ اکبر کے بستر مرگ کے پاس علما ہی جمع تھے اور وہ مسلمان ہی مرا، بیجا پور کے فرماں روا عادل شاہی سلطان کے دربار میں بوتل ہی پادری حاضر ہوا تو سلطان نے اثنائے گفتگو میں اس سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ اکبر بادشاہ عیسائی کی حیثیت سے مرا؟ پادری نے جواب دیا: جناب! کاش خدا ایسا ہی

(۱) یہ سعدی کے شعر کا محض مطلب ہے۔

کرتا، اس نے ہم لوگوں کو اسی غلط فہمی میں رکھا مگر وہ آپ ہی یعنی محمدؐ کے مذہب پر مرا، کوئی وجہ نہیں کہ پادری کے اس بیان کو رد کر دیا جائے کیوں کہ جہانگیر اپنی اس تزک میں جس کو اصلی سمجھا جاتا ہے اپنے باپ کے اوصاف کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

”میرے والد کے اوصاف حمیدہ تعریف اور توصیف کی حد سے بڑھے ہوئے تھے، اگر ان کی خوبیوں اور اعلیٰ اخلاق کے متعلق کتاب لکھی جائے تو بغیر کسی تکلف کے اور قطع نظر باپ اور بیٹے کے رشتے کے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بے حد و بیشمار اوصاف میں سے عشر عشر بھی بیان نہیں کیے جاسکتے، باوجود اس عظیم الشان سلطنت اور بے اندازہ اور بے حساب دولت اور خزانوں اور جنگی ہاتھیوں اور تر کی گھوڑوں کے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کبھی اپنی عاجزی اور فروتنی میں ذرہ برابر انحراف نہیں کیا وہ اپنے آپ کو مخلوقات میں کمترین مخلوق سمجھتے تھے اور خدا کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔“

دائم ہمہ جا، باہمہ کس، درہمہ حال      میدار نہفتہ چشم دل، جانب یار

(تزک جہانگیری ص ۷۱، اردو ترجمہ از اعجاز الحق فروسی ص ۸۶-۸۵)

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی یہ تصویر اس کی آخری زندگی کی ہے پھر جہانگیر اس کی مذہبی رواداری کا بھی ذکر اسی جوش و خروش کے ساتھ کرتا ہے:

”مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگوں کے لیے ان کی بے نظیر اور وسیع سلطنت میں دنیا کی دوسری سلطنتوں کے برخلاف کہ شیعوں کو سوائے ایران کے اور سنیوں کو سوائے روم، ہندوستان اور توران کے کسی اور جگہ رہنے اور بسنے کی وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جس طرح کہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرے میں تمام اقوام اور اہل مذاہب کے لیے جگہ ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ بادشاہ کا سایہ تو ذات الہی ہوتا ہے، اپنے ممالک محروسہ میں جس کی حدیں دریائے شور کے کناروں تک ختم ہو جاتی ہیں تمام اہل مذاہب اور مختلف

عقیدوں کے لوگوں کو خواہ ان کے عقیدے صحیح ہوں یا ناقص رہنے بسنے کے لیے جگہ دے کر ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی راہ کو بھی بند کر دیا تھا، سنی شیعہ کے ساتھ ایک مسجد میں اور یہودی عیسائی کے ساتھ ایک کلیسا میں اپنے اپنے طریقہ پر عبادت کرتے تھے، ان کا مسلک صلح کل تھا، ہر دین و مذہب کے اچھے لوگوں کے ساتھ مجاہدت کیا کرتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ اس کی فہم و استعداد کے مطابق التفات فرماتے تھے، ان کی راتیں بیداری میں گذرتی تھیں اور دن میں بہت کم سوتے تھے ان کا سونا دن اور رات میں ایک یا ڈیڑھ پہرے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ (ترک جہانگیری ص ۷۱ نیز اردو ترجمہ از اعجاز الحق قدوسی، ص ۸۶-۸۵)

اگر اکبر شروع سے آخر تک اسی پر عمل پیرا رہا تو وہ یقیناً اسلامی نقطہ نظر سے بھی قابل فخر حکمراں تھا لیکن اگر اس نے اس پر عمل کیا جس کا نقشہ ملا عبدالقادر بدایونی یا ابوالفضل نے پیش کیا ہے تو پھر اس کی اس غلطی کے لیے کوئی جواز نہیں پیش کیا جاسکتا۔

اکبر کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ ہندی شعر کہا:

پہلا سون مجلس گئی، تان سین سوراگ

ہاسینو، رمپو، بولی بوگیو پیر بل کے ساتھ

پہلا (بیکانیر کے پرتھوی راج) کے ساتھ مجلس ختم ہوگئی اور تان سین کے ساتھ

راگ ختم ہوا، ہنسی، خوش لطفی اور گفتگو پیر بل کے ساتھ ختم ہوگئی) (ہند آریائی اور ہندی از سنیتی

کمار چٹرجی، ترقی اردو بورڈ ص ۱۷۳) یہ شعرا کبر کی رواداری، غیر جانبداری، فراخ دلی بلکہ

سیکولرزم کے حامل ہونے کے لیے کافی تھا اس کو کوئی مذہبی تجربہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اکبر اعظم کا ہم جلیس اور ہمزاد ابوالفضل علم، ادب، فن، ذہانت، فطانت، خوشنیت

آرائی اور دقیقہ سنجی کا شہنشاہ اعظم تھا وہ اپنے شاہی آقا کی مزاج داری کی خاطر ایک ایسی

وادی میں بھٹکا جہاں اس کا اصلی ضمیر بھٹکنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ وہ گھر

میں ہوتا تو چالیس کاتب بیٹھے قرآن اور تفسیر لکھتے رہتے، (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۶۱۸) اس

نے ایک مناجات بھی لکھی اس کی ابتدا میں یہ گریہ وزاری بھی ہے:

الہی نیکاں را بہ وسیلہ نیکی سرفرازی بخشی

و بدایں را بہ مقتضائے کرم دل نوازی کنی

ابوالفضل کی عام رواداری: ابوالفضل پر چاہے جتنے الزامات رکھے جائیں وہ بے دین، ملحد، حب جاہ کی خاطر ضمیر فروش، آدمی کانوکر، بیگن کانوکر نہ سمجھا جائے مگر اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے دور میں ہندوستان کے اندر صلح دامن، مہر و محبت، رواداری و فراخ دلی کی فضا پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، اسی لیے اس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا اس مطالعہ کے بعد اس نے جن جذبات کے ماتحت ان کو قلم بند کیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے اگر وہ اسی قسم کی علمی مہم کو برابر جاری کیے رہتا تو اس کو دین الہی کے تجربہ میں شریک ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔

ہندوؤں کے علوم و فنون کو قلم بند کرتے وقت اس نے شروع میں لکھا ہے کہ وہ ہندوؤں کی عقل و دانش، ان کی نفس کشی، ان کے محاسن اور عادات و اطوار کو دلکش پیرائے میں بیان کرنا چاہتا ہے کہ اس خدمت سے ظاہری و باطنی ہر قسم کی دشمنی مہر و محبت سے بدل جائے اور عداوت و مخالفت کا خارستان دوستی و الفت کا سرسبز و شاداب چمن بن جائے اس طرح تعصب کے بغیر معقول دلائل سے صحیح نتائج اخذ کیے جائیں اور تحصیل علم کی گرم بازاری ہو۔ (آئین اکبری ص ۳ ص ۲)

وہ لکھتا ہے کہ بنی نوع انسان کے مختلف طبقات میں بیگانگی اور مخالفت پائے جانے کے بظاہر حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف و نا آشنا ہونا، اس ناواقفیت نے ایک دوسرے کے باہمی خیالات سے لاعلم رکھا پھر اس لاعلمی نے دشمنی کا سنگ بنیاد رکھ کر دنیا کو شورش کی گرد سے غبار آلود کر دیا۔

۲۔ ایسا کوئی واسطہ میسر نہ آیا جو باہمی بیگانگی کو مٹائے۔

۳۔ اس بے گانگی کی وجہ سے نفس پرست بندے آنکھوں کے اندھے اور کانوں

کے بہرے ہوتے گئے۔

۴۔ تن آسانی کی وجہ سے تحقیق و تفتیش کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی۔

۵۔ تقلید کی تیز وتند ہوا کی وجہ سے عقل و دانش کی شمع گل ہو گئی اور تحقیقات کی تمام

راہیں مسدود ہو گئیں، مسائل کی تحقیق اور ان پر رد و قدح کرنا کفر میں داخل ہو گیا۔

۶۔ دشمنی اور عداوت کی ہوا اتنی تیز چلی کہ دو تین افراد بھی ایسے نہیں جو ایک جگہ

بیٹھ کر تبادلہ خیالات کریں اور مہر و محبت کی دوستانہ مجلسوں کے ضروری کام کو انجام دیں،

خود بینی کا ایسا دور دورہ رہا کہ ہر فرد نے اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا خیال کیا اور دوسرے کو

بندگی کے دائرہ سے خارج کر کے خون ریزی، آبرو شکنی اور مردم آزاری کو مذہبی فریضہ میں

داخل کر لیا اور ان ہی تباہ کن افعال کو سرخوئی دارین کا وسیلہ سمجھا اگر دشمن کا مسلک حق ہے تو

اس کے پیروں کی خوں ریزی کے کیا معنی ہیں اور اگر وہ مذہب باطل کا گرویدہ ہے تو ظاہر

ہے کہ وہ روحانی مریض ہے، انصاف تو یہ ہے کہ بیمار معالجہ اور تیمارداری کا مستحق ہے، نہ کہ

مردم آزاری اور خوں ریزی کا۔

۷۔ ریا کاری اور خود سرائی سے مخلوق خدا کو دھوکہ دینا اور خود نمائی سے اپنے کو حقیقی

اور صادق رہنما سمجھنا بد طینت ہونے کی دلیل ہے۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۳۰۴)

اس کے بعد وہ ہندوؤں کے علوم و فنون کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس سے

بعض ناظرین تو فہم و فراست کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہو کر اتحاد و اتفاق کے گرویدہ

ہوں گے لیکن اکثر افراد غم و الم کے طوفان میں غرق ہو کر پریشان و حیران ہوں گے، اس کے

بعد وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کا

کتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اگر اس کو ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے اور اسی

کے ساتھ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہو جائیں تو اندازہ ہوگا کہ اکبری عہد کا یہ جلیل القدر مؤرخ انڈولوجی کا کتنا بڑا ماہر تھا۔

وہ لکھتا ہے کہ اس ملک کے ہندو خدا طلب، مہربان دل، غریب دوست، شگفتہ رو، کشادہ پیشانی، دوست دار، محبت ریاضت، انصاف پرور، کار گزار، نمک شناس ہوتے ہیں وہ پتھریا لکڑی یا اسی قسم کی اشیاء سے مورتیاں بنا کر ان کی توقیر ضرور کرتے ہیں، یہ لکھ کر لوگ ان کو بت پرست تصور کرتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے، مورتیوں کو محض بارگاہ ایزدی تک رسائی کے لیے وجہ ہمت خیال کرنے اور اپنے تصور کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے بناتے ہیں ورنہ وہ حقیقت میں خداوند تعالیٰ کی پرستش کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔

(آئین اکبری ج ۳ ص ۵)

وہ برہما کو آفرینش بشن کو اس کو باقی رکھنے والا اور رد کو اس کو فنا کرنے والا سمجھتے ہیں، ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تین مقدس شکلوں میں ظاہر ہوا مگر وہ اس کی بزرگی اور برتری کے خیال میں فرق نہیں آنے دیتے جیسا کہ نصاریٰ مسیح کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۵)

ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ انسانی رو میں اللہ کی عبادت، عمدہ عادات اور نیک اعمال سے اعلیٰ مراتب کو پہنچتی ہیں اس لیے ان کے مذہبی پیشوا ان کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ (ایضاً)

ابوالفضل نے ہندوؤں کے مذہبی فلسفہ میں نیا ویک پیشیکھک میمانسا، بیدانت، سانک پاتنجل اور ناستک وغیرہ کا تجزیہ بڑی دیدہ وری سے کیا ہے، (آئین اکبری ج ۳ ص ۲۸) بیدانت کے مطالعہ کے سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ اس کے ماننے والے صرف وجود واجب کے قائل ہیں، باقی تمام عالم کے وجود کو نمود بے بود تسلیم کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ دیگر موجودات کو محض خیالی اشکال سے تعبیر کرتے ہیں، دنیا کا منظر ان کے نزدیک محض عالم

جلد دوم

خواب ہے جس کی صفت خیال و وہم سے زیادہ نہیں ہے جس طرح انسان خواب کی حالت میں خیالی صورتیں اور شکلیں دیکھتا ہے اور ان کے مشاہدہ سے مسرور اور رنجیدہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں عالم بیداری کی حالت میں تمام عشرت انگیز اور غم و اندوہ کے واقعات سے دوچار ہو کر ان سے متاثر ہوتا ہے، یہ بیداری کا ایک طرح کا خواب ہے جس کے مشاہدے اوہام سے زیادہ وقت نہیں رکھتے جو اس فلسفہ کے قائل ہوتے ہیں وہ قدیم اور غیر قدیم کی تلاش میں رہتے ہیں، دنیا کو نظروں سے گرا دیتے ہیں اور اپنے مقصود کی طلب میں سرگرم رہتے ہیں، اپنے حواس اور مدد رکات کے فنا ہونے سے آزرہ خاطر نہیں ہوتے، خوشی اور غم کے جذبات میں گرفتار نہیں رہتے بلکہ مکت کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

(آئین اکبری ج ۳ ص ۶۲)

اسی طرح فلسفہ پانچل کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس کے معتقدوں کے یہاں خداوند تعالیٰ کے تصورات مختلف ہیں وہ ہستی اور دانش کو عین ذات سمجھتے ہیں وہ جسم کو فانی سمجھتے ہیں لیکن ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نیا قالب حاصل ہوتا ہے تو نئی زندگی ملتی ہے یہاں تک کہ مکت حاصل ہو جاتی ہے لیکن مکت جوگ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور جوگ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کوئی خواہش باقی نہیں رہتی ہے اس کے ماننے والے اس کی بھی تعلیم دیتے کہ تصور الہی میں مستغرق ہو کر اپنے قلب کو انوار الہی سے منور رکھا جائے یا الہی تمام بد اعمالیوں کو فنا کرتی ہے، اس راہ میں چلنے کے لیے ارادے نیک اور قدم مضبوط ہوں جب نفس کشی اور نیک اعمال اپنی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں تو آئینہ دل کا رنگ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے دل میں جو خیال آتا ہے اس کا انکشاف ہوتا رہتا ہے بلکہ وہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتا رہتا ہے۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۷۰-۶۹)

ابوالفضل نے ہندوؤں کے علوم کا خود مطالعہ کر کے دوسروں کو بھی اس کے مطالعہ کی ترغیب دی وہ لکھتا ہے کہ ہندوؤں کے اٹھارہ بدیا (علم) ہیں، علم کے اعلیٰ مرتبہ پر وہی



شخص فائز ہو سکتا ہے جو ان اٹھارہ علوم کی تہہ تک پہنچ کر دلی مقصد حاصل کرے، یہ علوم حسب ذیل ہیں:

۱۔ رگ بید کا علم ۲۔ یجر بید کا علم ۳۔ سام بید کا علم ۴۔ اتھر بن بید کا علم یہ چاروں کتابیں کلام الہی ہیں جن میں قابل اور پسندیدہ کام اور عمل اس کی جزا اور سزا، خدا کے تصور اور معرفت وغیرہ کا ذکر ہے ۵۔ پران کا علم یہ وہ اٹھارہ کتابیں ہیں جن میں مذکورہ بالا چاروں بیدوں کے مشکل مقامات کی تشریح ہے ۶۔ دھرم شاستر کا علم، اس میں بیدوں ہی سے باتیں مستخرج ہیں اس کو سمرت بھی کہتے ہیں ۷۔ شکشا کا علم، اس میں حروف کے مخارج کے ادا کرنے کا بیان ہے ۸۔ کلپ کا علم، جس میں زن و شو کے تعلقات کا بیان ہے ۹۔ یا کرن کا علم، جس میں نحو و صرف، اشتقاق اور لغت کے قواعد کی تعلیم ہے ۱۰۔ نرکت کا علم، اس میں ان علوم کی تعداد لکھی ہوئی ہے جو چاروں ویدوں سے مستخرج ہیں ۱۱۔ جوتک کا علم، اس میں ستاروں کے اثرات بیان کیے گئے ہیں ۱۲۔ چھند کا علم، اس میں اشعار کے بحر اور ان کے اقسام کا بیان ہے ۱۳۔ میمانسا کا علم، اس میں تناخ اور مکت کی تفصیل ہے ۱۴۔ نیامی کا علم، اس میں ریاضیات، منطق اور مناظر وغیرہ کے علوم شامل ۱۵۔ ایر بید کا علم، اس میں اعضا کی شناخت، حفظ و صحت، اقسام امراض اور ان کے معالجہ کا ذکر ہے ۱۶۔ دھنر بید کا علم، اس میں تیر اندازی اور دوسرے اسلحہ کا بیان ہے ۱۷۔ گاندھرو کا علم جس میں گانے بجانے کا ذکر ہوتا ہے ۱۸۔ ارتھ شاستر کا علم اس میں مال و اسباب کے جمع کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

(آئین اکبری ج ۳ ص ۹۴-۸۹)

ابوالفضل نے ہندوؤں کے گناہ و ثواب کے تخیلات کو سامنے لا کر اس کی کوشش کی کہ مسلمان ان کا مطالعہ کر کے ان کو سمجھنے کی کوشش کریں وہ لکھتا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں گناہوں کے بہت سے درجے ہیں، پہلے درجہ کے گناہ پانچ ہیں جس کا کوئی کفارہ نہیں ہو سکتا، ۱۔ برہمن کا مارنا ۲۔ ماں کے ساتھ بد فعلی کرنا ۳۔ برہمن، کھتری اور ویش کا شراب پینا

۳۔ دس ماشہ سونا سرقہ کرنا ۵۔ ایک سال تک اول الذکر چاروں میں سے کسی میں مبتلا رہنا۔

(آئین اکبری ج ۳ ص ۱۳)

دوسرے درجہ کے گناہ حسب ذیل ہیں: چھوٹا نسب بتانا، بادشاہ کے آگے کسی کی شکایت کرنا، استاد پر تہمت لگانا، یہ تینوں نگاہ برہمن کے قتل کرنے کے برابر ہے، زنا کرنا درجہ اول کے دوسرے گناہ کے برابر ہے، وید کا پڑھ کر بھول جانا، جھوٹی گواہی دینا اپنے عزیز کا قتل کرنا، حرام کھانا، درجہ اول کے تیسرے گناہ کے برابر ہے، امانت میں خیانت کرنا، آدمی، گھوڑا، جواہرات، چاندی اور زمین کا سرقہ کرنا چوتھے گناہ کے برابر ہے۔ (ایضاً)

تیسرے درجہ کا گناہ گائے کا مارنا، چوری کرنا، کسی عورت کو قتل کرنا، جادو کرنا، مردم آزاری کرنا، فاحشہ عورتوں کا طریقہ اختیار کرنا، استاذ اور والدین کی خدمت گزاری سے بے فکر ہونا، سود زیادہ لینا، برہمن اور کھتری کا تجارت کرنا، زنا (جنیو) کا وقت پر نہ باندھنا، مقدور رہتے ہوئے عزیزوں کی خبر گیری نہ کرنا، بیوی بچوں، باغ، کنویں اور تالاب کا فروخت کرنا، زمین کی پیداوار کو بلا وجہ برباد کر دینا، بڑے بھائی کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کا بیاہ کر دینا، یہ تمام گناہ گائے کے مارنے کے برابر ہیں۔ (ایضاً)

چوتھے درجہ کا گناہ نفاق کا پھیلانا، لڑکوں کے ساتھ بد فعلی کرنا، برہمن کو آزرہ کرنا، شراب اور بول و براز کا پینا۔ (ایضاً)

پانچویں درجہ کا گناہ ہاتھی، گھوڑا، اونٹ، ہرن، مینڈھا، بکرا، بھینس، گائے، مچھلی، گدھا، بلی، سور اور اسی طرح اور جانوروں کا مارنا ان چیزوں کی تجارت کرنا جن کی کچھ ضرورت نہیں اور جھوٹ بولنا وغیرہ ہے۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۱۳۸)

چھٹے درجہ کا گناہ چیونٹی وغیرہ کا مارنا اور شراب خوار کے ہاتھ یا اس کے برتن سے پانی پینا ہے۔ (ایضاً)

ساتویں درجہ کا گناہ میوہ، پھول اور لکڑی کا سرقہ کرنا اور بڑے کاموں میں

سراسمیہ ہو جانا ہے۔ (ایضاً)

ہندوان بارہ چیزوں کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں ۱۔ کرودھ: عقل پر قابو نہ رکھنا ۲۔ لو بھ: جاہ و مال کی ناپاک خواہش کرنا ۳۔ دریکھ: انسانوں کی بدخواہی کرنا ۴۔ راگ: ظاہری لذتوں کا گرویدہ ہونا ۵۔ مان: دوسروں سے خود کو بہتر سمجھنا ۶۔ موہ: بے سمجھی میں مبتلا رہنا ۷۔ مد: شراب یا مال یا جوانی یا سرداری یا دانائی کے نشہ میں مبتلا رہنا ۸۔ شوک: اپنا فرض دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اس کے نتائج پر غمگین ہونا ۹۔ متو: پونجی پر غرور کرنا ۱۰۔ اہنکار: خودنمائی میں مبتلا ہونا ۱۱۔ بھے: خدا کے سوا کسی اور سے ڈرنا ۱۲۔ ہرکھ: اپنی بھلائی اور دشمن کی برائی پر خوش ہونا۔ (آئین اکبری ج ۳ ص ۱۳۸)

خدا کو ڈھونڈنے والوں کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے مذکورہ بالا چیزوں سے الگ رہیں، جو اعمال دل کو نقصان پہنچاتے ہیں وہ یہ ہیں: ۱۔ دوسروں کی مطلوبہ چیزوں کی فکر کرنا ۲۔ بدی کے ارادے رکھنا ۳۔ خدا کے برگزیدہ لوگوں کو برا سمجھنا۔

جسم کو نقصان پہنچانے والے اعمال یہ ہیں: ۱۔ کسی کا مال بزور لینا ۲۔ بے گناہ کو رنج پہنچانا ۳۔ غیر عورت سے ملوث ہونا۔

زبان کے چار گناہ یہ ہیں: ۱۔ تلخ گوئی ۲۔ ناحق گوئی ۳۔ دوسروں کی برائیاں کرنا ۴۔ پریشان کن باتیں کہنا۔ (ایضاً)

اسی طرح ابوالفضل نے پرستش الہی، اوتاروں کے تذکرے، ناپاکی، پاکی، ناجائز لباس، ناپسندیدہ خوراک، کھانے پکانے کے دستور، روزے کے طریقے، بڑی پرستش گاہوں کے مراسم، موت کے وقت کے مراسم اور عمدہ موت وغیرہ کے عنوانات قائم کر کے ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے، یہ تمام تفصیلات آئین اکبری کی جلد سوم میں ملتی ہیں۔

ابوالفضل نے ان کو قلم بند اس لیے کیا کہ مسلمان ان کا مطالعہ کر کے ہندوؤں کی

مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کے بعد ہندوؤں سے متعلق ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، اگر ہندو مورخین بھی اسی قسم کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں سے متعلق پیش کرتے رہتے تو دونوں میں آج جو تفاوت ہے وہ کب دور ہو گیا ہوتا۔

اکبر اور رانا پرتاب: عہد اکبری میں رواداری اور فراخ دلی کو جو فضا پیدا ہوئی اس میں رانا پرتاب کا ابھرنا ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کا مطالعہ مورخانہ جانب داری کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے، رانا پرتاب میں راجپوتوں کی آن کا ہونا ضروری تھا وہ اپنی آن کی خاطر راجپوتوں کی روایت کے مطابق جان دینے میں حق بجانب تھا، اس نے اکبر کے خلاف لڑائی لڑنے میں اگر نسلی اور مذہبی جذبات ابھارے تو یہ قابل اعتراض نہیں سمجھا جاسکتا ہے مگر اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح موہ لیا تھا اس میں رانا پرتاب سنگھ کا نسلی تعصب زیادہ کارگر نہیں ہوا، اکبر کے راجپوت سردار رانا پرتاب کے خلاف مہم میں بلا تکلف شریک ہوتے رہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: راجہ رام ساہ، سال بھان، پرتاب سنگھ، رائے لون کرن جگناتھ، مادھو سنگھ، خود ٹاڈ کا بیان ہے کہ مرواڑ، میر، بیکانیر، بندی کے راجاؤں اور خود رانا پرتاب کے بھائی ساگر جی نے اکبر کا ساتھ دیا اور جب ہلدی گھاٹ میں رانا پرتاب اور اکبر کی فوجوں میں تصادم ہوا تو اکبر کی فوج کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، اس جنگ کی اہمیت موجودہ دور میں بہت سمجھی جاتی ہے مگر تیموری دور کے مورخین نے اس کو زیادہ اہم نہیں قرار دیا ہے، منتخب التواریخ کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی اس جنگ میں شریک تھے، انھوں نے اس کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں: وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی میں دونوں طرف راجپوت اتنے تھے کہ ان میں سے دوست اور دشمن کا پہچانا مشکل ہو گیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ شاہی فوج کی کمان مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی وہ قلب میں ہاتھی پر سوار تھا اور مسلمان فوجی سرداروں اور لون کرن حاکم سانبر کے علاوہ دوسرے راجپوت سردار بھی اس کی معیت میں تھے، ہراول میں نوجوان راجپوت آگے آگے تھے، اسی جنگ

میں رانا پرتاپ کی فوج کے ایک بازو کی سرداری حکیم سورا افغان کر رہا تھا جو غالباً رانا کا ساتھ اس لیے دے رہا تھا کہ سوری خاندان کا بدلہ مغل حکمران سے لے کر رہے، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ اس موقع پر راجہ مان سنگھ نے اپنی نبرد آزمائی کا پورا جوہر دکھایا پہلے دونوں طرف سے ہاتھی لڑنے لگے، راجہ مان سنگھ اپنے ہاتھی کا مہاوت خود بن گیا اور ایسی ثابت قلبی کا ثبوت دیا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا ہے، رانا کی فوج میں تذبذب پیدا ہو گیا تو پھر مان سنگھ کے بہادر محافظوں نے بڑھ کر ایسی گھمسان کی جنگ کی کہ ان کا کارنامہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور مان سنگھ نے اپنی سرداری میں جو کچھ کیا اسی سے معلوم ہوا کہ ملا شیری کا حسب ذیل مصرع کیا معنی رکھتا ہے: بع: کہ ہندوی زند شمشیر اسلام

(منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۳۳)

ملا عبد القادر بدایونی پر الزام ہے کہ وہ ایک متعصب مسلمان مؤرخ ہیں لیکن ہلدی گھاٹ کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے وہ بھی راجپوت اور ہندو لشکر یوں کے جذبہ وفاداری سے متاثر ہو گئے ہیں اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس جنگ میں دراصل ہندوؤں کے ساتھ اکبر کی رواداری، ہردلعزیزی، صلح جوئی، محبت اور اخلاص کی جیت تھی، مگر انگریز مؤرخین میں چیمس ٹاڈ نے اس جنگ کی کچھ ایسی تصویر کھینچی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندو مسلمان کی مذہبی لڑائی تھی، ٹاڈ کے بیان کے مطابق وہ راجہ مان سنگھ سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ اس نے ایک ترک کو اپنی بہن دی اور ترک کے ساتھ کھانا کھایا، اودے ساگر میں راجہ مان سنگھ اس سے ملنے آیا تو وہ اس سے نہیں ملا اور جب راجہ مان سنگھ چلا گیا تو اس زمین کو گنگا جل سے دھو کر پوتر کیا گیا اور وہاں کے لوگوں نے اشنان کر کے اپنے کو پاک کیا اور یہ اس لیے کہ راجہ مان سنگھ ترکوں کو دوست تھا، (ٹاڈ، ج ۱ ص ۲۶۰) ٹاڈ نے اپنی کتاب میں زیادہ تر من گھڑت داستانیں لکھی ہیں، اسی لیے امر ناتھ و دیا شنکر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

”بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ راجستھان کے مشہور مؤرخ چیمس

ٹاڈ کو بلا کر دربار کے ریزیڈنٹ نے اس امر کی ہدایت کی تھی کہ وہ مسلم حکمرانوں کے خلاف لڑائیوں میں راجپوت جیالوں کی مدح میں اپنی مشہور کتاب لکھے، یہ ہدایت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد راجپوتوں کو مسلمانوں سے دور کرنے کی غرض سے جاری کی گئی تھی۔

لیکن ٹاڈ نے جس طرح باہمی نفرت پھیلانے کے لیے اپنی کتاب لکھی، اسی انداز میں باہمی یگانگت اور موافقت پیدا کرنے کے لیے مغلوں کے عہد میں راجپوتوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کی تاریخ اگر سلیقے سے لکھی جاتی تو ہندوستان کی تاریخ میں جذباتی ہم آہنگی کا ایک روشن باب کھل جاتا مگر تعجب ہے کہ اس موجودہ دور میں ایسے مورخین پیدا ہو رہے ہیں جو یہ جذباتی ہم آہنگی نہیں چاہتے اور کچھ نہ کچھ ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جن سے دلوں میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے، ڈاکٹر جی۔ این شرمانے ایک کتاب 'میوار اینڈ دی مغل امپائرز' جو ۱۹۵۴ء میں آگرہ سے شائع ہوئی یہ ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا مقالہ بھی تھا اس میں وہ اکبر کو امپیرلیسٹ کہتے ہیں اور اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کو امپیریلزم اور علاقائی آزادی کی محبت کی لڑائی قرار دیتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں:

”رانا پرتاپ کا نام ہماری سرزمین کی تاریخ میں غیر فانی ہے وہ آزادی کا ایک عظیم سپاہی تھا جس نے اپنی ساری توجہ اسی جنگ کے لیے مبذول رکھی، اس کو اس کی پرواہ مطلق نہ رہی کہ اس کو کیا مادی فائدہ پہونچے گا اور کیا نقصان ہوگا اس نے ہندوؤں کے غرور کو بلند رکھا اور جب تک ہندوؤں کی نسل باقی ہے وہ بڑے فخر کے ساتھ اس یاد کو باقی رکھیں گے کہ اس نے ایک غیر ملکی کے خلاف جنگ کرنے میں اپنا سب کچھ بھینٹ کر دیا۔“ (ص ۱۲۱)

یہ اس اکبر کو امپیرلیسٹ اور غیر ملکی قرار دیا گیا ہے جس نے اپنے غیر مسلم ہم

وطنوں کے دلوں کی تسخیر کی خاطر اپنا مذہب چھوڑا، آفتاب کی پرستش کی، گائے کی تعظیم میں اس کے گوبر کو بھی پاک سمجھا اور گائے کا گوشت کھانا حرام قرار دیا، قشقہ لگایا، آگ کو سجدہ کیا وغیرہ وغیرہ۔



[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

## جہانگیر

جہانگیر اور نور اللہ شوستری: جہانگیر کی شخصیت اور حکمرانی دونوں میں دلاویزی بھی رہی اور رنگارنگی بھی اس میں مذہبی شدت بھی تھی اور رواداری بھی، اس پر الزام ہے کہ اس نے نور اللہ شوستری کو قتل کرایا جو شیعوں میں شہید ثالث سے یاد کیے جاتے ہیں ان کے قتل کی اصل وجہ کی تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی، جہانگیر اپنی تزک میں ان کے قتل کرنے کا ذکر مطلق نہیں کرتا حالاں کہ اس نے سکھوں کے گروارجن سنگھ کو قتل کرایا تو اس کا ذکر ہندو روایت کے مطابق اپنی تزک میں کسی جھجک کے بغیر کیا ہے، ذخیرۃ الخوانین جلد دوم (ص ۳۷۳) میں ہے کہ ”بہ تقریبے در غضب جہانگیری گشتہ گشت“ شیعوں کی کتابوں ہی میں ان کی شہادت کا ذکر ملتا ہے اور اگر واقعی اس نے ان کو قتل کرایا تو یہ یقینی ہے کہ اس نے شیعیت کے خلاف اشتعال اور تعصب میں ان کو قتل نہیں کرایا کیوں کہ بعد میں اس کے محل اور دربار میں شیعوں کا بڑا استیلا رہا، نور جہاں اس کی چہیتی بیوی نہیں بلکہ محبوبہ بن کر رہی وہ شیعہ تھی اس کے خاندان کا اثر جہانگیر کے عہد میں چھایا رہا، سادات ہارہہ شیعہ ہی تھے اس کی فوج میں وہ اس طرح غالب رہے کہ وہ فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے۔

حضرت مجدد الف ثانی سنیوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے لیکن جہانگیر نے



ان کو قید میں ڈال دیا کچھ دنوں کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو ان کو اپنے ساتھ رکھنے لگا۔  
بزرگان دین سے عقیدت کے باوجود نور اللہ شوستری کا قتل اور حضرت مجدد الف  
ثانی کی قید اس کی زندگی اور حکومت کا مسئلہ عقدہ لائیکل بن کر رہ گیا ہے جیسا کہ آگے ذکر  
آئے گا۔

جہانگیر اور گروارجن: اس نے سکھوں کے چوتھے گروارجن کو قتل کر دینے کا حکم دیا تو اس  
قتل کو اس کے مذہبی تعصب پر محمول نہیں کیا جاسکتا ہے وہ گروارجن کو ہندو ہی سمجھتا رہا، تزک  
میں لکھتا ہے کہ ارجن گوہندوال میں بیاس دریا کے کنارے رہ کر پیر اور شیخ بنا ہوا تھا، سادہ  
لوح ہندوؤں اور نادان مسلمانوں کو اپنے طریقہ پر داخل کرتا رہتا تھا، اپنی ولایت کا ڈھنڈورا  
پیٹ کر اپنے کو گرو کہلواتا تھا، چاروں طرف سے بے وقوف اور احمق لوگ اس کے پاس  
آتے اور اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے، تین چار پشت سے اس قسم کی دوکان جاری  
تھی، میرے دل میں مدتوں سے یہ بات آتی رہی کہ اس باطل دوکانداری کو ختم کر دیا جائے  
اور اس جرگے کو اسلام کی طرف لے آنا چاہیے۔ (نول کشور پریس ایڈیشن ص ۳۵)

جہانگیر کے بیانات سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ گروارجن کی مذہبی سرگرمیوں کو تو پسند  
نہیں کرتا تھا لیکن جب تک ان کی محض مذہبی سرگرمیاں جاری رہیں، اس نے ان کے خلاف  
کوئی کارروائی نہیں کی، اس کو غیر معمولی اشتعال خسرو کی بغاوت کے سلسلہ میں پیدا ہوا،  
شہزادہ خسرو نے اس سے بغاوت کی تو اس نے اپنی باغیانہ سرگرمیوں کے درمیان گروارجن  
کی قیام گاہ کے پاس بھی اپنا پڑاؤ ڈالا، جہانگیر لکھتا ہے:

”جب خسرو عبور کر کے ادھر پہنچا تو اس مردک مجہول (یعنی گروارجن) نے

ارادہ کیا کہ اس کے پاس حاضر ہو، خسرو جہاں مقیم تھا وہاں وہ آیا اس سے ملاقات

کی اور بعض باتیں جو میرے متعلق اس کو معلوم تھیں، شہزادہ تک پہنچائیں اور اس کی

پیشانی پر اپنی انگلی سے زعفران کا نشان لگایا جس کو شقہ کہا جاتا ہے، اس سے

اچھے شگون کا اظہار ہوتا ہے جب یہ بات مجھ کو معلوم ہوئی تو مجھے اس کی یعنی  
گرو کی باطل باتوں کا یقین ہو گیا، میں نے حکم دیا کہ اس کو حاضر کیا جائے، اس  
کے رہنے کی جگہوں اور لڑکوں کو مرتضیٰ خاں کے حوالہ کیا گیا، اس کے تمام اسباب  
واموال کو ضبط کر کے اس کو موت کی سزا دینے کا حکم دیا۔ (تزک ص ۳۵)

جہانگیر کی نظر میں یہ بات کھٹکی کہ گرو ارجن شہزادہ خسرو کی بغاوت کے طرف دار  
ہو گئے اور قشقہ لگا کر اس کی فتح و کامرانی کے لیے دعا گو ہوئے ہیں، اس لیے اس کو اشتعال آیا  
اور اس نے ان کو قتل کی سزا دے دی، گرو ارجن سکھوں کے بڑے مقدس پیشوا سمجھتے جاتے  
ہیں ان کے قتل کی سزا کا واقعہ تو بہت ہی المناک اور افسوس ناک ہے لیکن اس قتل کو سیاسی  
قتل کہا جاسکتا ہے، جدو ناتھ سرکار مغلوں کی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرب کاری لگانے  
کے لیے برابر تیار رہتے ہیں، اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم میں (ص ۹-۳۰۶)  
گرو ارجن کا ذکر کیا ہے جب جہانگیر نے ان کو موت کی سزا دی تو وہ لکھتے ہیں یہ کسی طور پر  
مذہبی ایذا رسانی کا واقعہ نہ تھا بلکہ ایک سیاسی مجرم کو جو اس زمانہ میں روایتی سزا دی جاتی تھی  
وہی سزا تھی۔ (تزک ص ۳۰۸)

جہانگیر اور گرو مان سنگھ: جہانگیر جینیوں کے گرو مان سنگھ سے بھی بدظن رہا کیوں کہ اس  
نے خسرو کی حمایت میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ جہانگیر کی حکومت دو سال سے زیادہ نہ رہے  
گی جس سے متاثر ہو کر جہانگیر کا ایک راجپوت سردار رائے سنگھ اس سے منحرف ہو گیا تھا،  
جہانگیر مان سنگھ سے بہت بدظن رہا لیکن اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے اس کی  
موت ہو گئی یہ خبر جہانگیر کو ملی تو وہ لکھتا ہے:

”اس نیاز مند درگاہ ایزدی کی نیت بخیر اور انصاف پر مبنی ہے اس لیے مجھے

یقین ہے کہ جو میرے حق میں برا سوچے گا اپنی نیت کے مطابق پھل پائے گا۔“

(ص ۲۱۹)

وہ اپنی حکومت میں جس کسی سے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو وہ اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کرتا پھر وہ شیعہ سنی اور ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ کرتا۔

جہانگیر اور شیخ ابراہیم بابا: اس کے پہلے سال جلوس میں لاہور میں شیخ ابراہیم بابا افغانی کے مریدوں میں افغانوں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس نے فوراً ان کو چنار کے قلعہ میں محبوس کر دیا۔ (ترک ص ۳۷)

وہ اپنی حکومت کے مخالفوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا خواہ وہ مذہبی پیشوا ہی کیوں نہ ہوتے پھر شاہانہ غصہ و اشتعال میں ان کے لیے سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا رہا، مثلاً شیخ ابراہیم بابا افغانی کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

”شیخ ابراہیم بابا افغانی شیخی و مریدی در یکے پرگنہ از پرگنات لاہور تربیت دادہ چنانچہ طریقہ اوباش و سعادت جمع کثیرے از افغانان بروگرد آمدہ اند، فرمودم کہ اورا حاضر آوردہ بہ پرویز سپارند، کہ در قلعہ چنار نگا دارند، تا ایں ہنگامہ باطل برہم خورد“۔ (ص ۳۷)

گروارجن کے متعلق بھی اسی قسم کے الفاظ اور جملے استعمال کیے جیسا کہ ذکر پہلے

آیا ہے۔

جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانی: جس طرح سکھوں کو اپنے گروارجن کے متعلق جہانگیر کی باتیں پڑھتے وقت تکلیف ہوتی ہوگی اسی طرح مسلمانوں کو جہانگیر کی اس تحریر کے پڑھتے وقت ہوتی ہے جو اس نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق لکھی ہے، جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانی کو گروارجن کی طرح قتل تو نہیں کیا لیکن ان کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ قتل کر دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہیں وہ اپنی ترک میں اپنے چودہویں سال جلوس میں لکھتا ہے:

”ان دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک جعل ساز (شیادے)

نے سرہند میں مکرو فریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے، اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک حلقہ مقرر کر رکھا ہے جو دوکانداری، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بہت سے خرافات لکھے ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لا طائل باتیں لکھی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کے راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا جو نہایت اونچا اور پاکیزہ تھا اور اس سے گذر کر مقام فاروق سے پیوست ہو گیا اور مقام فاروق سے گذر کر مقام صدیق کو عبور کیا، ہر مقام کی تعریف اس کے مطابق کر کے لکھا ہے کہ مقام محبوبیت میں پہنچ گیا، یہ مقام مشاہدہ تھا جو کہ نہایت منور اور دل کش تھا اور مجھ پر مختلف قسم کے انوار کا عکس پڑ رہا تھا، یعنی استغفر اللہ خلفا کے مقام سے گذر کر ان سے عالی تر مقام پر پہنچ گیا اس نے اسی طرح کی اور گستاخانہ باتیں لکھی ہیں جس کا لکھنا طوالت اور بے ادبی ہے، میں نے اس بنا پر حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو، میرے حکم کے مطابق آیا اور جو کچھ میں نے پوچھا اس کا معقول جواب نہیں دے سکا وہ ریاکار، بے عقل، مغرور، خود پسند معلوم ہوا، اس کے اس حال کی اصلاح کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ روز کے لیے اس کو قید کر دیا جائے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی، دماغ کی آشفتگی کچھ دور ہو جائے اور عوام کی شورش فرو ہو جائے، اس کو رانی رائے سنگھ دکن کے حوالے کیا کہ اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید رکھے۔ (ص ۴۷۵-۴۷۴)

کچھ دنوں کے بعد اپنے پندرہویں سال جلوس میں جہانگیر لکھتا ہے:

”شیخ احمد دوکان آرائی اور بے صرفہ گوئی کی خاطر کچھ دنوں کے لیے زندان ادب

میں مجبوس تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر رہائی دی خلعت اور خرچ کے لیے ایک ہزار روپے بھی دیے اور ان کو اختیار دیا کہ وہ چاہے چلے جائیں یا میرے ساتھ رہیں، انھوں نے انصاف کے ساتھ عرض کیا کہ اس تشبیہ اور تادیب سے ان کو ہدایت حاصل ہوئی انھوں نے ساتھ ہی رہنے میں اپنی مراد برآری دیکھی۔

(ص ۳۱۲)

اس رہائی کے بعد حضرت مجدد اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم

کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”الحمد لله وسلام على عباده الذين الصطفى اس طرف کے احوال اور اوضاع حمد کے لائق ہیں، بادشاہ کے ساتھ عجیب و غریب صحبتیں گذر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دیدیہ اور اصول اسلامیہ میں سرموستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب درویت و دیدار کے اثبات اور حضور خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا اور تراویح کی سنت اور تنازع کے باطل ہونے اور جن جنیوں کے احوال، ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا اور بادشاہ بڑی خوشی سے سنتے ہیں اس اثنا میں اور بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا، اقطاب، اوتاد، ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بھی بیان ہوا، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بادشاہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی ایسا تغیر ظاہر نہ ہوا جو برہمی پر دلالت

کرے، ان واقعات اور ملاقات سے شاید اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمت اور راز خفیہ ہوگا..... دوسرے یہ کہ قرآن مجید کو بادشاہ سے سورہ عنکبوت تک ختم کرا

چکا ہوں۔ (مکتوبات امام ربانی دفتر سوم نمبر ۴۳)

راقم نے اپنی ”کتاب ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر“ (ص ۱۷۶-۱۸۴) بزم تیموریہ جلد دوم (۱۳۹-۱۳۵) اور معارف (دسمبر ۱۹۸۰ء میں جہانگیر کے مذکورہ بالا بیانات پر کافی بحث کی ہے یہ بیانات عقدہ لائیکل ہیں، کیا جہانگیر اپنے ابتدائی دور حکومت سے چودہویں سال جلوس تک حضرت مجدد کے اصلی رتبہ سے ناواقف رہا، حضرت مجدد کے بہت ہی محبوب مرید شیخ مرتضیٰ خاں بخاری تھے وہ جہانگیر کے بھی بہت ہی مقرب درباری امیر تھے، اس کی تخت نشینی میں ان کا بڑا حصہ تھا جب وہ شاہی تخت پر بیٹھا تو اس نے ان کو صاحب السیف والقلم کا خطاب دیا اور بیچ ہزاری منصب بھی دیا (ماثر الامرا ج ۲ ص ۴۰-۶۳۳) حضرت مجدد کو ان سے امید تھی کہ وہ بادشاہ سے ترویج شریعت کرانے کی سعادت حاصل کر کے سب سعادت مندوں سے بازی لے جائیں گے (مکتوبات ربانی ج ۱ نمبر ۵۱ ص ۶۸) اور یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مجدد کے اثر سے شیخ فرید نے جہانگیر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسلامی شعار کے ساتھ حکومت کرے، جہانگیر نے اس کے لیے وعدہ بھی کر لیا، شیخ فرید کو چار علما کو مدعو کر کے اس کے دربار سے وابستہ کرنے کی ہدایت بھی دی تا کہ وہ مسائل شرعیہ بیان کرتے رہیں، شیخ فرید نے خوشی میں اس کی اطلاع حضرت مجدد کو دی جس کے جواب میں انہوں نے شیخ فرید کو تحریر فرمایا کہ اس مقصد کے لیے ایک عالم ہی کا انتخاب کیا جائے تو بہتر ہوگا تا کہ چار علما کے اختلاف سے مقصد فوت نہ ہو جائے (مکتوبات امام ربانی جلد ۱ نمبر ۵۳) وہ جہانگیر کے دربار کے ایک دوسرے بااثر امیر صدر جہاں (م ۱۰۲ھ) کو لکھتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے جاری ہونے اور مذہب مصطفوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دشمنوں کی خواری کی باتیں سن کر ماتم زدہ مسلمانوں کے دل کو خوشی ہوئی، اس باب میں اللہ

تعالیٰ کی مدد اور اس کا احسان ہے (مکتوبات امام ربانی نمبر ۱۹۴) جہانگیر کے دربار کا رکن رکین خاں اعظم (م ۱۰۳۳ھ) تھا، اس کو بھی حضرت مجددؒ سے بڑی محبت و عقیدت تھی، خود حضرت مجددؒ اس کے معترف تھے اس لیے اس کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہاری ہوی بازی میں اس کے سوا کوئی اور مرد میدان نہیں (مکتوبات ربانی ج ۱ نمبر ۶۵) اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں (۱۰۳۶ھ) اور اس کا لڑکا داراب خاں (م ۱۰۳۴ھ) اور دوسرے امرا بھی ان کے معتقد تھے، کیا جہانگیر ان امرا کے روحانی پیشوا سے بے خبر رہا؟ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ) گیارہ سال تک زندہ رہے؟ کیا انھوں نے حضرت مجددؒ کی عظمت اور بزرگی سے جہانگیر کو ناواقف رکھا؟ یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے۔

حضرت مجددؒ کے جس مکتوب پر جہانگیر نے ان کو مورد الزام قرار دیا اس میں دراصل ایک خواب کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ایک مکتوب میں کیا تھا اس کا خلاصہ ان ہی کی زبانی یہ ہے:

”دوسری غرض یہ ہے کہ دوسری دفعہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوتے، نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورینؒ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی، اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل و ارشاد کے مقام میں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت فاروق اعظمؒ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبرؒ کا مقام ظاہر ہوا، بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے

ہمراہ پایا تھا اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور ثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت ﷺ کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا اور حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ظاہر ہوا اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا بلند تھا جس طرح کہ صفحہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور مقام رنگین اور منقش تھا اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین پایا۔

(مکتوبات امام ربانی ج نمبر ۱)

اس خط کی شہرت پھیلی تو کچھ بد باطن اشخاص نے ان پر الزام رکھا کہ انھوں نے اپنے کو حضرت ابو بکرؓ سے افضل تر قرار دیا ہے لیکن وہ اس الزام کی تردید اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھ کر کرتے ہیں:

”وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل جانے اس کا مردو

حال سے خالی نہیں یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل۔“

جہانگیر نے اپنی مذکورہ بالا تحریر میں اسی خط کو سامنے رکھ کر ان پر الزام رکھا، حضرت مجددؒ نے یہ مکتوب جہانگیر کی تخت نشینی سے دو سال پہلے لکھا، جہانگیر اس کا ذکر اپنے چودہویں سال جلوس میں کرتا ہے، اتنی طویل مدت کے بعد اس کی رگ حمیت کیوں پھڑک اٹھی؟ شیخ فرید بخاری تو حضرت مجددؒ کی اسیری سے تین سال پہلے وفات پا چکے تھے مگر حضرت مجددؒ کے اور دوسرے معتقد امرا خاں اعظم، صدر جہاں، عبدالرحیم خانخاناں اور دارات خاں وغیرہ تو زندگی تھے وہ آخر خاموش کیوں رہے؟ وہ اپنے شاہی آقا کے سامنے اپنے روحانی آقا کے اخلاص، للہیت، بے خوفی، بے غرضی اور علوئے مقام کو تو ظاہر کر سکتے تھے یا ان کا ضمیر ان کے ذاتی مقادار و جاہت پرستی کی خاطر اتنا مردہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے



اپنے مذہبی پیشوا کے لیے کچھ کرنا پسند نہیں کیا، یا وہ دربار کے شیعئی امرا سے اتنے دب کر رہ گئے تھے کہ شیعئی امرا نے حضرت مجددؑ کے خلاف جہانگیر کو استعمال کیا اور ان کے لیے دم بخود رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، حضرت مجددؑ کے خلاف شیعئی امرا کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ دربار میں جو شیعئی اثرات بڑھ رہے تھے ان کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ سے زائل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، اس طرح حضرت مجددؑ کی اسیری کے سلسلہ میں شیعیت ضرور پس پردہ رہی، شاہی حرم میں نور جہاں کے داخل ہونے کے بعد دربار پر اس کے خاندان کے افراد چھا گئے جس سے شیعئی اثرات کا بڑھنا لازمی تھا، نور اللہ شوستری کا قتل شاہی حرم میں نور جہاں کے آنے سے پہلے ہو چکا تھا ظاہر ہے کہ شیعی بدول آزر رہے ہوں گے ممکن ہے کہ نور جہاں اور اس کے خاندان کے دباؤ سے جہانگیر نے اپنے شیعئی امرا کی خاطر داری کے لیے حضرت مجددؑ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گو بعد میں ان کے علوئے مقام کا معترف ہو گیا۔

اس کے علاوہ اس کی طرف بھی ذہن جاتا ہے کہ جہانگیر نے جب خود تزلزل قلم بند کرنا چھوڑ دیا تو سترہویں سال جلوس سے انیسویں سال جلوس تک کے کچھ حصے اس کے ندیم خاں محمد شریف نے لکھے جس کو اس نے معتمد خاں کا خطاب دیا وہ ایرانی یعنی شیعہ تھا، (ماثر الامراء، ج ۳ ص ۴۳۱) جہانگیر کے ایک اور درباری مرزا محمد ہادی نے تزلزل کا تامل لکھا یہ بھی شیعہ ہی تھا اس کے شروع میں دیباچہ بھی اسی کا تحریر کیا ہوا ہے وہ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے تزلزل جہانگیری کو اپنے قلم سے نقل کیا اور اس کا تامل بھی کیا ہے، یہ قرین قیاس ہے کہ اس نے یا معتمد خاں نے حضرت مجددؑ سے متعلق ایک ناروا تحریر بڑھا کر ان کی شیعیت دشمنی کا انتقام لیا ہو، اس کا ناقدانہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جہانگیر، ہمایوں، اکبر اور پھر شاہ جہاں سے زیادہ علم شناس تھا، اس نظر ادب، شاعری، لغت اور مذہبی علوم پر رہی اس مردم شناسی کی بھی بڑی صلاحیت تھی پھر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ

حضرت مجددِ کارتبہ ناشناس ہو کر اس نے ان کے اور ان کے مکتوبات کے متعلق ناروا اور تحقیر آمیز تحریر لکھ دی۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جہانگیر کا پوتا اپنی وسیع المشرقی کے باوجود حضرت مجددِ کا بڑا قدر دان تھا، سفینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے:

”از متاخرین مشائخ و صاحب ریاضت و مجاہدات و خوارق تصانیف اند، در

اواخر حال بعضے بر شیخ تہمت کردند کہ شیخ می گوید کہ مرتبہ من زیادہ از خلفائے

راشدین، اما این محض بہتان و افتراء مخالفان است بر شیخ“۔ (ص ۳۲۰)

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددِ کے خلاف افترا پردازی کی ایک مہم چلائی گئی جس

میں یقیناً غیر سنی ہی شریک ہوں گے، بہر حال ان کی اسیری کا روشن پہلو یہ ہے کہ جہانگیر

نور جہاں اور اس کے خاندان کے متعلقین کے ساتھ رہنے کے باوجود حضرت مجددِ کی رہائی

کے بعد ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا اور اس کو احساس ہوا کہ حضرت مجددِ ان لوگوں سے مختلف

ہیں جو اس وقت دربار کی زینت بنے ہوئے تھے، یہ اس کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا بین

ثبوت ہے۔

مذہبی پیشواؤں سے جہانگیر کی عقیدت: یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ نور اللہ

شوستری اور گوارجن کے قتل کرنے یا ابراہیم بابا اور حضرت مجددِ الف ثانی کو قید کرنے

میں اس زمانہ کے مذہبی پیشواؤں سے جہانگیر کی بیزاری کا ثبوت ہوتا ہے وہ تو اپنے اسلامی

حسن باطن کی بنیاد پر اپنے دور کے اکابر بزرگان دین سے ملنے میں برابر سبقت کرتا رہا،

حضرت سلیم چشتی کی درگاہ میں غیر شعوری طور پر اس کا ذہن مذہبی بنا جس کا اظہار برابر ہوتا

رہا اپنے بارہویں سال جلوس میں احمد آباد گیا تو وہاں کے مشہور بزرگ شیخ اسماعیل بن شیخ محمد

غوث سے ملا ان کو خلعت اور پانچ سو روپے دیے پھر جتنے بزرگ اس سے ملنے کے لیے

وہاں آئے ان کو خلعت اور جاگیریں عطا کیں اپنے کتب خانہ سے تفسیر کشاف، تفسیر حسین اور

روضۃ الاحباب وغیرہ قیمتی کتابیں نذر کیں پھر اس نے ایک عام حکم دیا کہ مشائخ کی اولادوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی جائیں۔ (تزک جہانگیری ص ۲۲۰)

وہ احمد آباد میں شیخ وجیہ الدین کی خانقاہ گیا تو اپنی تزک میں وہاں کا ذکر بڑے

احترام سے کرتا ہے لکھتا ہے:

”میں شیخ وجیہ الدین کی خانقاہ میں گیا جو محل کے پاس ہی تھی، مرزا خانقاہ کے صحن میں تھا اس پر فاتحہ پڑھی یہ خانقاہ میرے والد کے ایک ممتاز امیر صادق خاں نے بنوائی، شیخ وجیہ الدین، شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے، شیخ وجیہ الدین کی ارادت سے شیخ محمد غوث کی بزرگی ظاہر ہوتی ہے شیخ وجیہ الدین صوری فضائل اور معنوی کمالات سے آراستہ تھے، تیس سال پہلے ان کی وفات اس سفر میں ہوئی ان کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ جانشین ہوئے وہ بھی اپنی درویشی میں مشہور تھے جب ان کا وصال ہوا تو ان کے فرزند شیخ اسد اللہ ان کے جانشین ہوئے وہ بھی جلد عالم بقا کو سدھارے، ان کے بھائی شیخ حیدر سجادہ نشین ہوئے وہی اس وقت موجود ہیں وہ اپنے آباء و اجداد کی مزار کی نگہبانی اور درویشوں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر ان کی بزرگی ظاہر ہوتی ہے، شیخ وجیہ الدین کا عرس ہو رہا تھا میں نے ایک ہزار پانچ سو روپے عرس کے اخراجات کے لیے شیخ حیدر کو عنایت کیے، خانقاہ میں جو فقرا موجود تھے ان کو اپنے ہاتھ سے پندرہ سو روپے خیرات دیے، پانچ سو روپے شیخ وجیہ الدین کے بھائی کو بھی دیے اسی طرح خانقاہ کے وابستگان اور مستحقین کے لیے اخراجات اور زمین مرحمت کی، شیخ حیدر سے کہا کہ اور جو درویش اور مستحقین ہوں ان کے نام بتائیں تاکہ ان کو روپے اور زمین سے مدد کی جائے۔ (ص ۲۱۲)

وہ اپنے تیرہویں سال جلوس میں پچاس برس کا ہوا تو شمسی سال سے اس کے وزن لینے کی تقریب آگرہ کے پاس کا کر یہ میں منائی گئی یہ رمضان شریف کا مہینہ تھا جہاں اور تقریبیں منائی گئیں وہاں علما اور صلحا کی بھی مجالس منعقد کی گئیں وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے جمعہ کے روز حکم دیا کہ اس مقام کے مشائخ اور ارباب سعادت جمع کیے جائیں، اس کے ساتھ افطار کریں، رات تک ان کی صحبت رہی تین رات مسلسل یہ مجلس رہی جب یہ ختم ہوئی تو میں کھڑا ہوا زبان حال سے کہا:

خداوند گارا تو نگر توئی	توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشایم نہ فرماں وہم	یکے از گدایان این در گہم
تو بر خیز و نیکی دہم دسترس	وگر نہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاہ را خداوندگار	خداوند را بندہ حق گذار

اس مناجات میں بڑی قابل قدر عاجزی، بے چارگی اور بندگی کا اظہار ہے۔

(ترک جہانگیری ۲۴۳)

وہ اپنے چودہویں سال جلوس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملا تو ان کے متعلق لکھتا ہے کہ دہلی کے گوشہ میں بیٹھ کر مدت سے توکل و تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی صحبت بے فیض نہیں، طرح طرح کے مراحم و دل نوازی کر کے ان کو رخصت کیا انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں مشائخ ہند کے حالات ہیں اس کے لکھنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے (ترک ص ۲۸۲) وہ اسی سال پنجاب گیا تو کلانور پہنچ کر اس کو سندھ کے مشہور بزرگ شیخ میر محمد مشہور بہ میاں میر سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا جو اس وقت لاہور میں تھے اس کا لاہور جانا ممکن نہ تھا اس لیے حضرت میاں میر خود اس کے پاس تشریف لائے ان کی ملاقات کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

”بعد کو یہ خبر ملی کہ لاہور میں میاں شیخ محمد میر نام کے ایک درویش ہیں، سید

ہیں، بہت فاضل، مرتاض، مبارک نفس اور صاحب حال بزرگ ہیں، تو کل  
وعزالت کے گوشہ میں رہتے ہیں، فقر کی دولت سے غنی اور دنیا سے مستغنی ہیں  
ان اوصاف کو سن کر میرا دل ان کی ملاقات کے لیے بے قرار ہوا ان کو دیکھنے کی  
بے حد خواہش پیدا ہوئی، میرا لاہور جانا ممکن نہ تھا اس لیے ان کی خدمت میں  
لکھ کر اپنے اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا وہ اپنی کبر سنی اور ضعیفی کے باوجود تکلیف  
اٹھا کر تشریف لائے، ایک مدت تک ان کے ساتھ بیٹھ کر فوائد حاصل کیے،  
بلاشبہ ان کی ذات بہت ہی شریف ہے اس زمانہ کو بہت غنیمت جانا، میں  
نیاز مند بن کر ان کی صحبت میں رہا ان سے حقائق و معارف کی بہت سی اونچی  
باتیں سننے میں آئیں، میں نے ہر چند چاہا کہ ان کی خدمت میں نذرانہ پیش  
کروں لیکن میں نے ان کو اس سے بلند پایا نذرانہ دینے کی ہمت نہ ہوئی اور نہ  
ان سے درخواست کی، آخر میں ہرن کی کھال کی ایک سفید جانمازاں کی  
خدمت میں گذرانی۔ (تزک جہانگیر نول کشور پریس ص ۹۰)

ہندو پنڈتوں کی صحبت: اکبر کے سلسلہ میں ذکر آیا ہے کہ جہانگیر اپنے والد کی مرعجاں  
مریج پالیسی کا بڑا معترف تھا وہ لکھتا ہے کہ ان کا مسلک صلح کل تھا، ہردین مذہب کے اچھے  
لوگوں سے مجالست کیا کرتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ اس کی فہم و استعداد کے مطابق  
التفات فرماتے تھے (ص ۱۷) جہانگیر بھی اسی مسلک کا پابند تھا وہ پنڈتوں سے مذہبی بحث  
بھی کر لیتا تھا اپنی تزک میں لکھتا ہے:

”ایک دن پنڈتوں سے جو ہندوؤں کے داناؤں میں سے ہوتے ہیں میں نے  
پوچھا کہ اگر تمہارے دین کی منشا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات مقدس دس مختلف  
پیکروں میں حلول کرتی ہے تو ارباب عقل اس بات کو رد کر کے قبول نہیں کرتے  
اس سے یہ فساد لازم آتا ہے کہ واجب تعالیٰ میں جو تمام تعینات سے پاک

ہے، طول، عرض اور عمق پایا جالے اور اگر مراد ان جسموں میں نور خداوندی کا ظہور ہے تو خدا کا نور تو تمام موجودات میں ساری ہے، ان دس پیکروں میں کوئی خصوصیت نہیں اگر اس سے مراد خدا کی صفات میں کسی صفت کا اثبات ہے تو اس صورت میں بھی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، اس لیے ہر دین و آئین میں صاحبان معجزات و کرامات ہوئے ہیں جو اپنے زمانہ کے دوسرے لوگوں سے دانش و فراست میں ممتاز تھے جب کچھ کہنے سننے اور بہت رد و بدل کے بعد وہ اس خدا کی خدائی کے قائل ہو گئے جو جسم اور چون و چگون سے پاک ہے تو یہ کہنے لگے کہ ہمارا فکر ذات مجرد کی دریافت میں ناقص ہے ہم صورت کے وسیلے کے بغیر اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے اس لیے ہم نے ان دس اوتاروں کو اپنی دریافت اور معرفت کا ذریعہ بنا لیا ہے میں نے کہا کہ یہ اوتار معبود حقیقی تک رسائی کا ذریعہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ (ص ۱۵)

جہانگیری محل میں مندر کی تعمیر: جہانگیری کی اس قسم کی بحث افہام تفہیم کے لیے ہوا کرتی تھی، کوئی بڑے سے بڑا متعصب مؤرخ بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں ہندو مسلمان کی تفریق کی اس کی سب سے بڑی رواداری تو اس وقت ظاہر ہوئی جب اس نے اپنے محل کے اندر ایک مندر بنوایا اور اس میں ہنومان جی کی مورتی رکھوادی اس کے آثار آگرہ میں جہانگیری محل میں اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں یہ مندر غالباً جہانگیری کی ہندو ماں اور ہندو بیویوں کی سہیلیوں اور کنیزوں کے لیے بنوایا گیا تھا جو جہیز میں کثیر تعداد میں راجپوت شہزادیوں کے جلو میں آیا کرتی تھیں۔

راجپوت سرداروں سے جہانگیری کی محبت: جہانگیری کے نانہالی رشتہ داروں میں سب ہی راجپوت تھے کیوں کہ اس کی ماں راجہ بہار اہل کچھواہہ کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی پھر اس کی مختلف شادیوں سے راجپوت خاندانوں میں رشتہ ہوا اس کی پہلی شادی راجہ بھگوان

داس کی لڑکی اور راجہ مان سنگھ کی بہن مان بانی سے ہوئی اس کی اور شادیاں راجہ اودے سنگھ کی لڑکی جگت گسائیں راجہ کیشو داس راٹھور کی لڑکی کرم سی، لاہور کی پہاڑی علاقہ کے راجا دریا بلھاس کی لڑکی، جیسلمیر کے رادل بھیم کی لڑکی، راجہ مان سنگھ کے بڑے لڑکے جگت سنگھ کی لڑکی سے بھی ہوئیں ان رشتوں کی وجہ سے وہ راجپوتوں اور ہندوؤں سے موانست اور یگانگت کے جذبات کیوں نہیں رکھتا وہ اپنی تزک میں ان راجپوت راجاؤں کے خلاف تو سخت الفاظ استعمال کرتا رہا جو اس سے برسر پیکار ہوتے لیکن اپنے دربار کے راجپوت سرداروں کے لیے اس کے قلم سے محبت و الفت کے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی دکھائی دیتی ہیں، جہانگیر اپنے پانچویں سال جلوس میں شیر کاشکار کے لیے پرگنہ باری کے جنگل میں گیا وہاں ایک چیتے سے اس کی مڈ بھینٹ ہو گئی اس نے اس پر بندوق چلائی چیتے کو گولی لگی تو وہ غضب ناک ہو کر جہانگیر اور اس کے ہمراہیوں پر حملہ آور ہوا، انوپ رائے ایک راجپوت سردار ساتھ تھا وہ جہانگیر کو بچانے کی خاطر چیتے سے سینہ سپر ہو گیا اس نے چیتے کے سر پر دو ڈنڈے مارے، چیتے نے غصہ میں انوپ رائے کے دونوں ہاتھ اپنے منہ سے پکڑ لیے پھر تو دونوں میں ایسی کشتی ہونے لگی جیسے کوئی دو پہلو ان لڑ رہے ہوں، دیر تک کشتی ہوتی رہی، انوپ رائے نے اپنی تلوار سے چیتے کے چہرے پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کی دونوں آنکھیں کٹ کر رہ گئیں انوپ رائے کے اور ہمراہی اس کی مدد کو پہنچے اور مل کر چیتے کو ہلاک کیا، جہانگیر نے چیتے سے انوپ رائے کے جرأت مندانہ بہادرانہ مقابلہ کا ذکر اپنی تزک کے دو صفحے میں کیا ہے آخر میں لکھتا ہے کہ جب وہ اپنے زخموں سے اچھا ہو کر میرے پاس آیا تو میں نے اس کی جاں سپاری سے متاثر ہو کر اس کو انی رائے سنگھ دکن کا خطاب دیا، ہندی میں انی رائے کے معنی سردار فوج اور سنگھ دکن کے شیر کو مارنے والا ہیں۔

(تزک جہانگیری ص ۹۱-۹۰)

جہانگیر کو اپنے راجپوت فوجی سرداروں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کو یقین رہتا کہ اس

کی خاطر اس کے راجپوت فوجی سردار میدان جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے اور اگر کوئی فوجی سردار شکست کھا کر اس کے پاس آتا تو وہ اس کو راجپوتوں کی نسلی غیرت و حمیت کی یاد دلاتا، رام داس کچھواہہ کو اس نے راجہ کرن کا خطاب دے رکھا تھا اس کو اپنے چھٹے سال جلوس میں ملک عنبر کے خلاف دکن بھیجا مگر وہاں اس کو شکست ہوئی، جہانگیر کے پاس حاضر ہوا تو جہانگیر نے اس سے کہا جنگ سے راجپوتوں کا بھاگنا معیوب ہے، افسوس ہے کہ تجھے راجہ کرن کے خطاب کی بھی شرم نہیں آئی اس کو دربار میں آنے سے منع کر دیا لیکن جب اس کی خفگی جاتی رہی تو بعد میں اس کو بنگلہ کی مہم پر مامور کیا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۵۶-۱۵۵)

وہ راجپوتوں کی دلداری اور دل جوئی ہر موقع پر کرتا رہا کسی موقع پر ان کی دل شکنی نہ ہونے دیتا اس کے اٹھارہویں سال جلوس میں شاہی فوج مہابت خاں کی کمان میں دکن میں مقیم تھی، اس میں راجپوت کا ایک فوجی سردار راجہ گردھر تھا مسلمان فوجی سرداروں میں ایک سید کبیر تھے، سادات جہانگیر کی فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ایک معمولی سی بات پر راجہ گردھر اور سید کبیر کے لشکریوں میں جھگڑا ہو گیا جو اتنا بڑھا کہ راجہ گردھر چھبیس راجپوت سرداروں کے ساتھ ہلاک ہو گیا، سید کبیر کی طرف سے بھی چار سید مارے گئے یہ خبر پھیلی تو راجپوتوں اور سیدوں میں خوفناک کشت و خون ہونے والا تھا کہ مہابت خاں نے اپنی حکمت عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرو کیا، اس نے راجہ گردھر کی قیام گاہ پر جا کر اس کے لڑکوں سے تعزیت کی جہانگیر کا حکم پا کر سید کبیر گرفتار کر لیے گئے اور محض راجہ گردھر کے لڑکوں اور راجپوتوں کی خاطر سید کبیر قصاص میں قتل کر دیے گئے۔ (تزک جہانگیری ص ۳۸۳ آئین اکبری انگریزی ترجمہ ص ۳۷۶) حالاں کہ جہانگیر سادات بارہہ کا بڑا قدر دان تھا اس قدر دانی کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

”سادات بارہہ را کہ از شجاعان زمان خود اند، و در ہر معرکہ بودہ اند، کاراز

ایشاں شدہ“۔ (ص ۳)



مگر راجپوتوں کی دل داری کی خاطر اپنی اس قدر دانی کو نظر انداز کر دیا۔

میواڑ میں جنگ کی نوعیت: رانا پرتاپ سنگھ کا خاندان مغل بادشاہوں سے برابر برسر پیکار رہا، اکبر نے جس طرح میواڑ میں لشکر کشی کی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے جب جہانگیر کو اس خاندان کی مخالفت کا سامنا ہوا تو اس نے اپنی ہوش مندی سے اس کو ہندو مسلمان کا اختلاف ہونے نہیں دیا اس لیے جب اپنی جانشینی کے پہلے سال رانا امر سنگھ کے خلاف لشکر بھیجا تو اس کے فوجی سرداروں میں راجہ بہار امل کالڑ کا بیچ ہزاری منصب دار، راجہ جگناتھ خود راجہ امر سنگھ کا چچا رانا ساگر، راجہ مان سنگھ کا بھتیجا مادھو سنگھ، اس کا پوتا مہا سنگھ اور راجہ منوہر سنگھ کچھواہہ اور رائے لون کرن کچھواہہ بھی تھے، یہ تو فوجی سردار تھے ان کی نگرانی میں بے شمار راجپوت لشکری تھے رانا امر سنگھ اس لشکر کشی کی تاب نہ لاسکا اس لیے صلح کر لی لیکن پھر اپنی مخالفت پر آمادہ ہو گیا، جہانگیر کو اپنے تیسرے سال جلوس میں ایک فوج بھیجی پڑی جس کی رہنمائی مہابت خاں نے کی اس کے ساتھ راجہ نرسنگھ دیو، نرائن داس کچھواہا اور راجہ کشن راٹھور تھے، مؤخر الذکر نے اپنی شجاعت اور دلیری سے غنیم کے تین ہزار راجپوت سواروں اور سرداروں کو اپنی قید میں لے لیا، اس کی بہادری سے خوش ہو کر جہانگیر نے اس کو منصب دو ہزاری ذات ہزار سوار عطا کیا، مہابت خاں نے امر سنگھ کو زیر کرنے میں دیر لگائی تو جہانگیر نے اپنے دوسرے فوجی سردار عبداللہ خاں کو وہاں بھیجا اس کے بعد اس مہم کی کمان راجہ باسو کو دی گئی پھر شہزادہ خرم بھیجا گیا جس کے بعد رانا امر سنگھ نے سپر ڈال دی اس کی پسپائی میں رائے سندر داس کا بھی بڑا ہاتھ رہا اس نے اپنی شجاعت کا جو ہر دکھا کر رانا کے ملک کو تاخت و تاراج کر کے اس کی بنیاد کو کمزور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اس خدمت کے صلہ میں جہانگیر نے اس کو رائے رایان کا خطاب دیا، رانا امر سنگھ پسپا ہوا تو اس خاندان کی پذیرائی جس طرح جہانگیر نے کی وہ اس کی رواداری اور فراخ دلی کا بڑا ثبوت ہے، رانا امر سنگھ جہانگیر کے لیے آٹھ نو سال تک باعث تشویش بنا رہا، پسپا ہو کر پہلے تو شہزادہ خرم سے آکر ملا اور درباری

آداب کے مطابق سجدہ کیا پھر اپنے لڑکے رانا کرن سنگھ کو جہانگیر کے پاس اجمیر بھیجا وہ بھی سجدہ بجایا یا جب وہ جہانگیر کے پاس آیا تو اس خاندان کی ساری مخالفت کو بھول گیا، رانا کرن سنگھ کی دلدادگی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، تزک میں لکھتا ہے:

”کرن کی طبیعت میں وحشت تھی، مجلسوں کا عادی نہ تھا پہاڑوں میں زندگی

بسر ہوتی اس کو رام کرنے کے لیے میں نے روزانہ نئی نئی عنایتوں سے نوازا،

دوسرے دن خنجر مرصع، تیسرے دن زین مرصع کے ساتھ عراقی گھوڑا اپنی طرف

سے بھیجا اور پھر دربار جا کر نور جہاں بیگم کی طرف سے خلعت فاخرہ، شمشیر

مرصع، اسپ بازین اور ہاتھی مرحمت کیا اس کے بعد نہایت قیمتی مروارید کا مالا

عطا کیا اس کے دوسرے دن ایک ہاتھی بھیجا، میرے دل میں یہ بات تھی کہ اس

کو ہر قسم کی چیزیں دی جائیں، اس لیے تین باز، تین حرے، ایک قبضہ شمشیر،

ایک بکتر، ایک جوشن اور دو انگوٹھیاں بھی بھیجیں جن میں سے ایک میں لعل کا اور

دوسری میں زمر کا نگینہ تھا، اخیر مہینہ میں ہر قسم کے کپڑے، ہر قسم کی خوشبوئیں،

طرح طرح کے طلائی ظروف سوخوانوں میں چن کر احمادیوں کے کندھوں پر

دیوان خاص و عام میں منگوائے اور سب کرن کو عطا کیے۔ (تزک جہانگیری ص

۱۲۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، نیز ہندوستان کے عہد وسطیٰ

کا فوجی نظام از مرتب، ص ۱۱۷-۱۱۵)

ان ہی الطاف و اکرام کی نکہت بیزیوں اور شمیم انگیزیوں کی بدولت راجپوت

تیموری بادشاہوں کے گرد ویدہ ہو کر ہر موقع پر اپنی جان نثاری کا ثبوت دیتے رہے ان کے

دلوں میں یہ بات جم گئی تھی کہ تیموری بادشاہوں کی بادشاہت قومی بادشاہت میں منتقل ہو گئی

ہے، کسی موقع پر ان میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوا، اسی لیے وہ رانا پرتاپ کے خاندان

کا ساتھ دینے بجائے اس سے بھی برسر پیکار رہے وہ اس خاندان کی مخالفت کو اپنی قومی

غیرت اور حمیت کے منافی نہیں سمجھتے رہے، موجودہ دور کے بعض مورخوں اور شاعروں نے اس خاندان کی جنگ کو کچھ اور رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی لیکن بقول ڈاکٹر رام پرشاد تریپاٹھی اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کسی حال میں ہندو ازم اور اسلام کی جنگ نہیں کہی جاسکتی ہے۔ (رائز اینڈ فال آف مغل امپائر از آر۔ پی۔ تریپاٹھی ص ۲۲۳)

جہانگیر کے دربار کے راجپوت امرا: جہانگیر کے دربار سے جو راجپوت وابستہ رہے اس کی فہرست پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ اندازہ ہو کہ اس نے اپنے باپ ہی کی طرح راجپوتوں کے ساتھ فراخ دلی سے کام لیا اور ان کو اپنی سلطنت کا جزو لاینفک بنا رکھا تھا، اسی لیے وہ ان کی خاطر سربکف ہو کر میدان جنگ میں لڑتے تھے اور کبھی کسی موقع پر اپنے معاشرتی اور مذہبی جذبات کو مجروح ہوتے ہوئے محسوس نہیں کرتے۔

راجہ مان سنگھ: راجہ مان سنگھ کا ذکر جہانگیر اس طرح کرتا ہے کہ ”راجہ مان سنگھ میرے والد کا بہت ہی معتبر اور معتمد امرا میں تھا اس خاندان اور میرے خاندان سے عظیم الشان نسبت اور لگاؤ رہا اس کی پھوپھی میرے والد سے بیاہی گئی اور اس کی ہمشیرہ کی شادی مجھ سے ہوئی جس سے خسر و اور اس کی بہن سلطان النساء بیگم پیدا ہوئی، یہ دونوں میری پہلی اولادیں تھیں میں نے اس کو بدستور سابق صوبہ بنگالہ کا حاکم بنایا حالانکہ اس سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے تھے کہ جس کی بنا پر وہ ان عنایات کا مستحق نہ تھا اس کو خلعت، چار قبضہ، شمشیر مرصع اور اسپ خاصہ سے سرفراز کر کے صوبہ بنگالہ کی طرف روانہ کیا جو پچاس ہزار سواروں کی جگہ ہے، اس کے باپ کا نام راجہ بھگوان داس اور دادا کا نام راجہ بہار امل تھا، کچھواہہ اور راجپوتوں میں سب سے پہلے میرے والد کی ملازمت کا شرف جس نے حاصل کیا وہ راجہ بہار امل تھا جو اپنی سچائی اور شجاعت میں پوری قوم میں امتیاز خصوصی رکھتا تھا۔ (ترک جہانگیری ص ۸)

جہانگیر کی عام رواداری کا اندازہ اس کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہوگی اپنی تخت نشینی کے موقع پر لکھتا ہے:

”میرے والد کے ملازمین کے اخلاص کی حقیقت کا ابھی بظاہر کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن ان میں سے بعض اپنے تصور، غلط بینی اور ناشایستہ ارادہ پر شرمندہ تھے کیوں کہ ان کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کو پسند نہ تھا، اس لیے میں نے بھی اپنی تخت نشینی کے دن ان سب کو معاف کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ان سے گذشتہ امور کی باز پرس نہیں کی جائے گی پھر میرے دل میں ان سے جو خدشات تھے ان کے سلسلہ میں امیر الامرا پر پورا بھروسہ تھا، میں ان کو اپنا محافظ اور نگہبان سمجھتا تھا حالاں کہ تمام بندوں کا نگہبان اللہ تعالیٰ ہے اور خصوصاً بادشاہوں کا جن کا وجود دنیا کے فلاح و بہبود کے لیے ہے۔“ (تزک جہانگیری ص ۸-۷)

راجہ نرسنگھ دیوبندیلہ: راجہ برسنگھ یا نرسنگھ راجہ مدھکر کالڑکا تھا، شہزادہ سلیم جب شیخ ابوالفضل سے خفا ہوا تو اس نے راجہ نرسنگھ دیوبہی کے ذریعہ سے اس کا قتل کرایا اکبر کے زمانہ میں تو وہ جنگلوں میں چھپا رہا لیکن جب جہانگیر تخت پر بیٹھا تو اس کو اپنے یہاں سہ ہزاری منصب پر فائز کیا، تیسرے سال جلوس میں وہ رانا کی مہم پر مہابت خاں کے ساتھ تعینات ہوا اور اپنی کارگزاری کے صلہ میں خلعت، گھوڑا اور انعام پایا، چوتھے سال جلوس میں خان جہاں کے ساتھ دکن کی مہم پر بھیجا گیا، ساتویں سال جلوس میں چار ہزار ذات دو ہزار اور دو سو سوار کا منصب پایا چودہویں سال جلوس میں اس میں مزید اضافہ ہوا، اٹھارہویں سال جلوس میں پھر رانا کے خلاف ایک مہم میں روانہ کیا گیا، جہانگیر اور شہزادہ خرم کی آویزش میں وہ جہانگیر کا وفادار رہا اور وہ شہزادہ خرم کا برابر تعاقب کرتا رہا، جہانگیر کے بائیسویں سال جلوس میں وفات پا گیا، مآثر الامرا کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کو جہانگیر کے زمانہ میں اتنی دولت اور عزت حاصل ہو گئی تھی کہ ہندوستان کے راجاؤں میں کسی اور کو حاصل نہ تھی، اس نے مٹھرا کا مندر تینتیس لاکھ روپے خرچ کر کے بنوایا اور ارند چھ میں بھی عالیشان عمارتیں بنوائیں جو شان و شوکت میں دوسری تمام عمارتوں سے ممتاز تھیں، اس نے اپنی حویلی کے قریب بھی ایک مندر

بنوایا، پرگنہ متھرا میں شیر ساگر تالاب بنوایا تو اس کا محیط ساڑھے پانچ کوس تھا، اسی طرح اس کا تعمیر کردہ سمندر ساگر تالاب کا دورتیں کوس تھا، متھرا محال میں تقریباً تین سو تالاب بنوائے اس کے دولڑ کے جھجار سنگھ اور پہاڑ سنگھ بھی شاہانہ نوازش سے سرفراز کیے گئے۔ (تزک جہانگیری ص ۷۱-۷۹-۱۰۰-۱۱۳-۱۳۸-۲۶۹، آثار الامراج ص ۲ ص ۱۹۹-۱۹۷)

راجہ انوپ بڑگو جرائی رائے سنگھ دلن: راجپوتوں کی گوت بڑگو جر سے تھا، اکبر کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں داخل ہو کر خواصوں کا سردار مقرر ہوا پہلے ذکر آیا ہے کہ ۱۵ جلوس جہانگیری میں پرگنہ باری میں جہانگیر شکار میں تھا کہ انوپ سنگھ کی مڈ بھینٹ ایک شیر سے ہو گئی، دونوں میں کشتی ہونے لگی انوپ سنگھ نے بڑی بہادری دکھائی اور شیر کو مغلوب کیا جہانگیر نے خوش ہو کر انی رائے سنگھ دلن (یعنی سپہ سالار شیر کا مارنے والا) خطاب دیا اور امرائے خاص میں منسلک کر لیا ایک دن جہانگیر نے انوپ سنگھ کی کسی بات پر اعتراض کیا اس نے فوراً جمدھر کمر سے کھول کر اپنے پیٹ پر دے مارا لیکن بچ گیا، جہانگیر اس وفاداری سے بہت متاثر ہوا اور بڑی بڑی ذمہ داریاں اس کے سپرد ہونے لگیں، مہم بنگلہ پر گیا اور دوسری لڑائیوں کی بھی سربراہی کی جہانگیر کے چودہویں سال جلوس میں دو ہزاری ذات و شش صد سوار کا منصب پایا، شاہ جہاں کے زمانے میں منصب سہ ہزاری اور ایک ہزار پان صد سوار سے سرفراز ہوا۔ (تزک جہانگیری ص ۲۶۸، آثار الامراج ص ۲ ص ۲۲۰)

ادواجی رام: قوم کا دکھنی برہمن تھا، جہانگیر نے اس کو منصب چہار ہزاری ذات چہار ہزار سوار عطا کیا، دکن کے مالی و ملکی انتظام انی رائے سے انجام پاتے تھے، شاہ جہاں کے عہد میں منصب پنج ہزاری ذات، پنج ہزار سوار سے سرفراز اور چالیس ہزار روپیہ نقد انعام پایا، خاں جہاں لودی کے خلاف لشکر کشی میں بھیجا گیا۔ (آثار الامراج ص ۱۲۲)

راجہ پاسو: پنجاب کے شمالی پہاڑوں میں دو آبہ سے ملی ہوئی مسو اور پٹھان کوٹ کے نام کی ریاست کا رہنے والا تھا، اکبری عہد میں وہ حکومت سے سرکشی کرتا رہا، جہانگیر کے زمانہ میں

منصب سے ہزاری و پانصدی پر سر بلند ہو کر مہم دکن پر بھیجا، آٹھویں سال جلوس میں وفات پا گیا اس کے دولڑکے راجا سورج اور جگت سنگھ مغل دربار میں نوازے گئے، (تزک جہانگیری ص ۲۴ تا الامراء ج ۲ ص ۱۵۷) جہانگیر اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ برابر اخلاص اور بندگی کے ساتھ پیش آتا رہا۔

رائے بہاری داس بخشی: برہمن تھا پہلے احدیوں کا بخشی پھر برہان پور کا واقعہ نویس اور آخر میں صوبہ دکن کا دیوان مقرر ہوا، ۱۷ جلوس میں رائے کرن کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ (تزک جہانگیری ص ۳۵۴)

رائے بنوالی داس: شاہی فیل خانہ کا داروغہ تھا ۱۴ جلوس جہانگیری میں منصب شش صدی کمیصد و بست سوار اور رائے کا خطاب پایا۔

راؤ سور پھوڑیہ: بیکانیر کے راجہ رائے راج سنگھ کا لڑکا جہانگیر کے عہد میں منصب سے ہزاری ذات، دو ہزار سوار تک ترقی پائی لیکن شاہ جہانی عہد میں منصب چہار ہزاری ذات سے ہزار و پانصد سوار پر فائز ہوا، کابل، تلنگانہ، دکن اور وکٹوریائیوں میں شریک رہا۔ (تاثر الامراء ج ۲ ص ۲۱۲)

راجہ چیمار سنگھ بندیلہ: بندیلہ کے راجہ بر سنگھ دیو بندیلہ کا بیٹا تھا، جہانگیر کے آخر زمانہ میں منصب چہار ہزار ذات، چہار ہزار سوار پر سر فراز تھا، شاہ جہاں کے زمانہ میں اس کو علم و نقارہ بھی عطا کیا گیا اور ہفت ہزاری کا منصب ملا۔ (تاثر الامراء ج ۲ ص ۲۱۴)

راجہ بھرت بندیلہ: اوند چھ کے راجہ بر سنگھ دیو کا پوتا تھا راجہ سنگھ دیو کے مرنے کے بعد بھرت کو جہانگیر نے اپنے ساتویں سال جلوس میں منصب اور راجا کا خطاب دیا، مہابت خاں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو جو امر اس کے تعاقب میں بھیجے گئے اس میں راجہ بھرت بھی تھا، اس کو شاہ جہاں دربار میں بھی بڑا اعزاز حاصل ہوا۔ (تاثر الامراء ج ۲ ص ۲۱۴)

راجہ جگت سنگھ: راجہ باسو کا چھوٹا بیٹا تھا، جہانگیر کے آخر عہد تک منصب سے ہزاری ذات دو

ہزار سوار تک ترقی پائی، شاہ جہاں نے اس کو ان منصب پر قائم رکھا اور مختلف اوقات میں مختلف خدمات کے لیے کابل، قندھار اور کانگرہ بھیجا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۲۳۸)

راجہ بہاؤ سنگھ: راجہ مان سنگھ کا چھوٹا بیٹا تھا، جہانگیر اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اس کو مرزا راجہ کہتا دکن میں مامور تھا اس کی وفات ہوئی تو جہانگیر لکھتا ہے کہ شراب پینے کی وجہ سے وہ بہت ہی ضعیف ہو گیا تھا اسی زبوں حالی کی وجہ سے اس پر ایک روز غشی طاری ہو گئی، اطبانے ہر قسم کی تدبیریں کی لیکن اس کو ہوش نہیں آیا اور وہ وفات پا گیا اس کی دو بیویاں اور آٹھ کنیریں تھیں جو اس کی چتا پر جل مریں اس کا بڑا بھائی جگت سنگھ اور اس کا بھتیجا مہا سنگھ تھا یہ دونوں بھی شراب خواری میں مشغول تھے ان سے راجہ بہاؤ سنگھ نے عبرت حاصل نہیں کی اور جان دے دی بڑا وجیہ نیک اور سنجیدہ تھا میری شہزادگی کے زمانہ سے ساتھ رہا میں نے اس کی تربیت کی اور بیچ ہزاری منصب تک پہنچا، اس کے کوئی لڑکانہ تھا اس کے بڑے بھائی کا پوتا بھی کسمن تھا مگر اس کو میں نے راجہ کا خطاب دیا اور منصب دو ہزاری ذات و ہزار سوار عطا کیا اور انبر کی جاگیر دی۔ (ترک جہانگیری ص ۱۱-۱۲-۱۳)

راجہ جگت سنگھ: راجہ مان سنگھ کا بڑا بیٹا تھا اس کی لڑکی کی شادی جہانگیر سے ہوئی تو جہانگیر خود لکھتا ہے کہ راجہ کی سرفرازی کے لیے میں نے اسی ہزار روپے سا جن میں بھیجے یہ شادی مریم زمانی کے محل میں ہوئی، جہیز کے سامان میں ساٹھ ہاتھی تھے۔

(ترک جہانگیری ص ۷۰-۶۹)

رام چندر بندیلیہ: رام چندر بندیلیہ کی خواہش پر جہانگیر نے اپنے چوتھے سال جلوس میں اس کی لڑکی سے شادی کی۔ (ترک جہانگیری ص ۷۸)

راجہ کلیان جیسلمیری: جہانگیر اپنے گیارہویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ جیسلمیر کا راجہ کلیان راجہ کشن سنگھ کے مساعی سے دربار میں آیا تو اس نے ایک سو مہر اور ایک ہزار روپے نذرانے میں پیش کیے اس کا بڑا بھائی راول بھیم صاحب جاہ و مقام تھا جب وہ مرا تو اس کا

ایک لڑکا دو مہینے کا تھا لیکن وہ بھی مر گیا جب میں شہزادہ تھا تو راول بھیم کی لڑکی سے میری شادی ہوئی اور وہ ملکہ جہاں کہلائی، یہ خاندان بڑا ہی خواہ رہا اس لیے یہ رشتہ قائم ہوا، روال بھیم کلیان دربار آیا تو میں نے اس کو راجہ کا ٹیکہ لگایا اور راول کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (تذکرہ جہانگیری ص ۱۶۰-۱۶۳)

سر بلند رائے رام راج راؤ رتن ہاڈا: راؤ بھوج ہاڈا کا بیٹا تھا، باپ کی خطاؤں کی وجہ سے کچھ دنوں شاہی عنایات سے محروم رہا لیکن جہانگیر کے تیسرے سال جلوس میں دربار میں حاضر ہوا تو جہانگیر نے اسے سر بلند رائے کا خطاب دیا، ۸ میں شہزادہ خرم کے ساتھ رانا کے خلاف مہم پر گیا، ۱۰ میں دکن بھیجا گیا، ۱۸ جلوس میں شہزادہ خرم کو گرفتار کرنے کے لیے مامور ہوا اور اپنی خدمت کے صلہ میں منصب پنج ہزاری ذات پنج ہزار سوار اور رام راج کے خطاب سے نوازا گیا، شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو فراخ دلی سے کام لے کر اس کے منصب کو برقرار رکھا، خلعت، جڑاؤ، خنجر، علم، نقارہ، گھوڑا مع طلائی زین اور ہاتھی بھی عطا کیا اور مہابت خاں کے ساتھ کابل کی مہم پر بھیجا گیا وہاں سے آنے کے بعد تلنگانہ اور دکن کی مہم میں شریک رہا۔ (آثار الامراء ج ۲ ص ۲۰۸)

روپ چند گوالیاری: ۱۵ جلوس جہانگیری میں کانگرہ کے قلعہ کی فتح میں بڑی مفید خدمات انجام دیں اس کے صلہ میں جہانگیر نے گوالیاری جاگیر دی اس کی نصف آمدنی انعام میں اور نصف تنخواہ میں محسوب ہوتی تھی۔ (تذکرہ جہانگیری ص ۳۲۶) شاہ جہانی عہد میں منصب ہزاری ذات شش صد سوار پر سرفراز ہوا، سری نگر کے راجہ کے خلاف مہم میں مارا گیا۔

راجہ سورج سنگھ راٹھور: راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹا راجہ کا بیٹا اور جو دھ پور کے راجہ مال دیو کا پوتا تھا، پہلے ذکر آیا ہے کہ اودے سنگھ کی لڑکی جگت گسائیں شہزادہ سلیم کے ساتھ بیاہی گئی جس سے شہزادہ خرم پیدا ہوا اسی اودے سنگھ کا لڑکا راجہ سورج سنگھ تھا، اکبری دربار سے منسلک ہوا اور جہانگیر کے ۴ جلوس میں منصب چہار ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب



پایا، بعد میں اس کو پنج ہزاری منصب بھی ملا، ۸ جلوس جہانگیری میں شہزادہ خرم کے ساتھ جے پور سے رانا کے خلاف بھی لڑا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۷۹)

رائے رائے سنگھ راٹھور: رائے کلیان مل والی بیکانیر کا بیٹا تھا، اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی اس کی بیٹی سے کی، رائے سنگھ کا منصب اکبر کے زمانہ میں چار ہزاری کا تھا جہانگیری نے اپنی تخت نشینی کے وقت اس کا منصب پنج ہزاری کر دیا، (ترک جہانگیری ص ۲۲) وہ اس کو قابل اعتماد راجپوت امرا میں سمجھتا رہا لیکن اپنے دوسرے سال جلوس میں لکھتا ہے کہ رائے سنگھ جو معتبر راجپوت امیر تھا دربار میں حاضر ہوا اس سے خسرو کے قضیہ میں جو تقصیر ہوئی تھی اس پر نام اور شرمسار تھا وہ امیر الامرا شریف خاں کے توسط سے میری خدمت میں حاضر ہو کر معافی کا خواستگار ہوا میں نے اس کے قصور کو معاف کر دیا جس وقت میں آگرہ سے خسرو کے تعاقب میں روانہ ہوا تو میں نے اس پر پورا اعتماد کر کے اس کو آگرہ میں محل کی نگرانی کے لیے چھوڑا تھا کہ جب میں محل کی خواتین کو طلب کروں تو وہ ان کو اپنے ساتھ لائے جب میں نے محل کی خواتین کو طلب کیا وہ بھی ان کے ساتھ دو تین منزل آیا لیکن متھرا میں بعض بیہودہ باتوں میں آگیا اور محل کی خواتین کو چھوڑ کر اپنے وطن چلا گیا، مجھ کو شبہہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی فتنہ اور شورش پھا کر دے گا اور دیکھنا پڑے گا کہ کیا صورت پیدا ہوتی ہے، خدائے کار ساز بندہ نواز نے تھوڑی ہی عرصہ میں ایسا انتظام کیا کہ مفسدوں کی جماعت منتشر ہو گئی، رائے سنگھ کی نمک حرامی ثابت ہو گئی امیر الامرا کی خاطر سے میں نے حکم دیا کہ رائے سنگھ کا جو منصب ہے وہ برقرار رکھا جائے اور اس کی جاگیر بحال رہے۔ (ترک جہانگیری ص ۶۳)

رائے رایان پتر داس بکرماجیت: جہانگیری اس کے بارے میں اپنی جانشینی کے وقت خود لکھتا ہے کہ پتر داس نے میرے والد کے زمانہ میں رائے رایان کا خطاب پایا تھا اس کو راجہ بکرماجیت کا خطاب دے کر اپنا میرا آتش مقرر کیا میں نے حکم دیا کہ ہمیشہ اس کے ساتھ توپ خانہ میں پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپ گاڑیاں فرائض کے انجام دینے کے لیے

مستعد اور تیار رہا کریں وہ کھتری تھا، میرے والد کے زمانہ میں فیمل خانے کے میرمنشی سے ترقی کر کے دیوانی اور امرائی کے مرتبہ تک پہنچا تھا، سپہ گری اور تدبیر سے یہ چیز خالی نہیں ہے۔ (تزک جہانگیری، ص ۱۱)

رائے سورج سنگھ، المعروف بہ راؤ سور بھورتیہ: بریکانیر کے راجہ رائے راج سنگھ راٹھور کا لڑکا تھا جہانگیر کے آخر عہد تک منصب سہ ہزاری ذات دو ہزار سوار تک پہنچا، شاہ جہاں کے زمانہ میں علم و نقارہ کے ساتھ چہار ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب پایا، بلخ اور دکن کی مہم میں مفید جنگی خدمات انجام دیں۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۱۱)

عمدۃ الملک رائے رایان: سندرداس نام تھا، پہلے شہزادہ خرم کی سرکار میں عام منشیوں کے زمرہ میں داخل ہوا ترقی کر کے میرسامان کا عہدہ پایا، ۹ جلوس میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو رانا امر سنگھ کے خلاف فوج لے کر بھیجا تو سندرداس بھی اس مہم میں تھا اور اپنے حسن و ساطت سے رانا امر سنگھ کو جہانگیر کی خدمت میں لا کر حاضر کر دیا، اس صلہ میں جہانگیر نے اس کو رائے رایان کا خطاب دیا، ۱۲ جلوس میں شہزادہ خرم اور افضل خاں کے ساتھ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں سفیر بن کر گیا اس خدمت کو بڑی عمدگی سے انجام دیا اور وہاں سے پندرہ لاکھ روپے ایک قیمتی لعل لا کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیے جس کے انعام میں جہانگیر نے معزز خطاب راجہ بکر ماجیت عطا کیا پھر گجرات کا علاقہ فتح کر کے جہانگیری حکومت کی سرحد سمندر سے ملا دی، ۱۳ جلوس میں جہانگیر نے قلعہ کانگرہ کی مہم پر بھیجا اس قلعہ کی تسخیر کے بعد اس کو عمدۃ الملک کا خطاب ملا، ۱۵ جلوس جہانگیری میں ملک عنبر کی سرکوبی کے لیے دکن بھیجا گیا، منصب پنج ہزاری سے سرفراز رہا، نقارہ رکھنے کی بھی اجازت تھی وہ شہزادہ خرم کا بڑا وفادار رہا شہزادہ کی آویزش جہانگیر سے ہوئی تو وہ اتفاقی طور سے ہلاک ہوا اس کا بھائی کہنرداس اس کی نیابت کے لیے احمد آباد میں رہتا تھا ذات کا برہمن تھا۔

(تزک جہانگیری ص ۱۳۲، ۳۱۹، ۳۵۷ مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۹۵-۱۸۳)

راجہ سارنگ دیو: جہانگیر کے سترہویں جلوس میں ہزاروپانصدی ذات و شش صد سوار کا منصب پایا، (تزک جہانگیر ص ۳۶۳) شاہ جہاں کے عہد میں نمبر کوٹ اور چھپار سنگھ بندیلہ کی سرکوبی کے معرکہ میں شریک ہوا۔

راجہ سنگرام: جموں کا راجہ تھا، ۱۴ جلوس جہانگیری میں منصب ہزاروپانصدی ذات ہزار سوار کا منصب اور راجہ کا خطاب پایا، (تزک جہانگیری ص ۲۹۰) کانگڑے کی مہم میں شریک رہا شاہ جہاں کے عہد میں دولت آباد اور پندرہ کے قلعوں کی تسخیر میں اہم جنگی خدمات انجام دیں۔

ستر سال کچھواہہ: راجہ بھگوان داس کا پوتا اور مادھو سنگھ کا بیٹا تھا آخر جہانگیری عہد میں منصب ہزاروپانصدی پایا، شاہ جہاں کے عہد میں دکن کی مہم میں نظام شاہی فوج کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ (مآثر الامراء، ج ۳ ص ۳۲۲)

راجہ شیام سنگھ: جہانگیر کے ۱۰ جلوس میں منصب سہ ہزاری ذات و ہزار چہار صد سوار پر سر بلند ہوا اور ۱۱ جلوس میں بنگش میں انتقال کیا۔ (تزک جہانگیری ص ۱۳۹)

رانا سکرا: رانا سانگا کے لڑکے اودے سنگھ کا بیٹا تھا اس کے بھائی رانا پرتاپ نے اکبر سے جنگ کی تو وہ اکبر کے دربار سے منسلک ہو گیا اور جہانگیر کے زمانہ میں پہلے سال جلوس میں بارہ ہزار کا انعام پایا اس کی حمایت میں رانا کے خاندان سے لڑا، اس نے دلپت بھارتیہ کی سرکشی کو بھی جہانگیری طرف سے لڑ کر بڑی خوبی سے فرو کیا، ۱۱ جلوس جہانگیری میں منصب سہ ہزاری ذات دو ہزار سوار پا کر بہار میں متعین ہوا، ۱۳ جلوس جہانگیری میں وفات پائی تو اس کا لڑکا مان سنگھ صوبہ بہار میں متعین ہوا۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۱۷۴)

راجہ کشن داس: پہلے مشرف فیل خانہ تھا، ۷ جلوس جہانگیری میں راجہ کا خطاب پایا اور اس نے اپنی کوشش سے راجہ کلیان جیسلمیری کو جہانگیر کے دربار میں لا کر حاضر کر دیا، ۱۶ جلوس میں دو ہزاری منصب پا کر دہلی کا فوجدار مقرر ہوا۔ (تزک جہانگیری ص ۱۱۱-۱۶۰-۳۴۹)

کشن سنگھ راٹھور: راجہ اودے سنگھ راٹھور کا بیٹا تھا اور راجہ سورج سنگھ کا بھائی تھا رانا کے

خلاف مہم میں شریک تھا، ۱۰ جلوس میں منصب سہ ہزاری ذات ہزاروپانصد سوار سے سرفراز ہوا۔ (تذک جہانگیری، نول کشور پریس ایڈیشن ص ۷۳-۱۳۹)

راجہ کلیان: راجہ ٹوڈرل کا بیٹا تھا، منصب ہزاروہفت صدی ذات ہزارپاکراڑیسہ کی حکومت پر سرفراز ہوا۔

کیشو داس ماروراٹھور: اپنی تخت نشینی کے موقع پر جہانگیر لکھتا ہے کہ کیشو داس مارو میرٹھ کے راجپوتوں میں سے ہے اپنے ہم عصروں سے اخلاص میں سبقت لے گیا ہے میں نے ہزاروپانصدی کا منصب دے کر اس کے اصل اور مرتبہ میں اضافہ کیا۔

۱۰ جلوس جہانگیری میں منصب دوہزاری پایا اور ۱۱ جلوس میں صوبہ دکن میں متعین ہوا۔ (تذک جہانگیری ص ۱۰ تذکرۃ الخوانین ج ۲ ص ۳۸۱)

رانا کرن: رانا پرتاپ کا پوتا اور رانا امر سنگھ کا بیٹا تھا، رانا امر سنگھ نے کرن کو جہانگیری دربار میں بھیجا تو جہانگیر نے خلعت پہنوا کر شمشیر مرصع کمر سے بندھوائی پھر دوسرے دن خنجر مرصع، تیسرے دن عراقی گھوڑا مع زین مرصع اور خلعت فاخرہ عطا کیا اس کے بعد قیمتی مروارید کی تسبیح، تین بار، تین جرے، ایک قبضہ شمشیر، ایک بکتر، ایک جوشن، قیمتی انگوٹھیاں طرح طرح کے کپڑے اور طلائی برتین عطا کیے، دسویں سال جلوس میں جہانگیر نے اس کو پنج ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا کیا، ۱۲ جلوس میں رانا امر سنگھ کی وفات کے بعد جہانگیر نے کرن کو رانا کا خطاب دیا جس کے بعد وہ جہانگیری کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا، جہانگیر نے رانا امر سنگھ اور کرن کے اٹیچو بھی آگرہ میں جھروکہ درشن کے نیچے نصب کرائے تھے۔ (تذک جہانگیری ص ۱۳۷-۱۶۲ آثار الامراء، ج ۲ ص ۲۰۱)

رائے گودھن سورج دھج: وہ دریائے گنگا کے کنارے کھاڑی کارہنے والا تھا شروع میں کچھری میں بیٹھ کر نقل نویسی کرتا تھا لیکن قسمت نے یاوری کی توجہ اعتماد الدولہ کی دیوانی ملی تو وہ اس کے خدمت گاروں کا بخشی مقرر ہوا جس کے بعد اس کو رائے کا خطاب ملا اور

اعتماد الدولہ کی سرکار کا دیوان ہو گیا، اس کا اعتبار اتنا بڑھا کہ تمام ہندوستان کا مدار المہام سمجھا جاتا تھا خانخانان عبدالرحیم خاں تک اس کے مکان پر جایا کرتا تھا، نور جہاں کا اقتدار بڑھا تو وہ اس کی سرکار میں بھی صاحب اختیار ہو گیا لیکن جب مہابت خاں نے جہانگیر سے سرکشی کی تو وہ اس کے ساتھ ہو گیا اور اس نے شاہی خزانوں اور دہلیوں کا سراغ مہابت خاں کو بتا دیا جس سے وہ بدنام ہوا یہ فتنہ فرو ہو تو وہ قید کر دیا گیا جس کے بعد اس کی وفات ہو گئی اس نے اپنے قصبہ کھاڑی کو پختہ عمارتوں سے آراستہ کیا، لاہور کے راستے میں سرائے اور بڑا تالاب بھی بنوایا، متھرا میں دریا کے کنارے گوردھن نگر نام کا ایک بڑا مندر بنوایا، اُجین میں بھی ایک تالاب اور ایک مندر کی تعمیر کی۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۱۹۶-۱۹۵)

راجہ گردھر کچھواہہ: ۷۱ جلوس جہانگیری تک ترقی پا کر راجہ کا خطاب منصب دوہزاری ذات ہزارو پانصد سوار پر فائز ہو گیا تھا، (تزک جہانگیری ص ۳۶۴) ۱۸ جلوس میں دکن کی مہم پر شاہی لشکر کے ساتھ گیا تھا کہ کسی بات پر راجہ گردھر کے راجپوت لشکریوں اور ایک دوسرے منصب دار سید کبیر سے کچھ جھگڑا ہو گیا جس میں راجہ گردھر مارا گیا، مہابت خاں سپہ سالار کو اس سے بڑا دکھ پہنچا راجہ گردھر کے قصاص میں سید کبیر کو قتل کر دیا۔

(تزک جہانگیری ص ۳۸۳)

برائے مانی داس: جہانگیر کے محلات کا داروغہ تھا، شاہ جہاں کے عہد میں دیوان مقرر ہوا، دیوان کل (وزیر اعظم) کے دونائب ہوتے تھے ایک دیوان تن اور دوسرا دیوان خالصہ، پہلے کے ذمہ ملازموں اور جاگیرداروں کی تنخواہ کا حساب کتاب ہوتا تھا دوسرے کے سپرد خالصہ شریف کا دفتر ہوتا تھا، وزیر اعظم کے بعد یہ دونوں عہدے بہت معزز سمجھے جاتے تھے۔

راجہ مان سنگھ: راوت شکر کا لڑکا تھا بہار میں مامور تھا چودہویں سال جلوس میں منصب ہزاری ذات شش صد سوار کا منصب پایا، (تزک جہانگیری ص ۲۷۱) کانگرہ کی مہم میں بھیجا گیا پہاڑی راجہ سنگرام کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

چھوٹے منصب دار یہ تھے: راجہ بھیم نرائن (ہزاری ذات پانصد سوار) پھر جو (چہار صدی) وہی چند گوالیار (ہزار پانصدی ذات پانصد سوار) حکیم رگھناتھ (ہشت صدی ذات شش صد سوار) موہن داس (ہشت صدی پانصد سوار) راجہ نتھ مل (دو ہزاری ذات ہزارو پانصد سوار) پر بھان (دو ہزاری ذات ہزارو پانصد سوار) بروے نرائن ہاڈا (نہ صدی شش صد سوار) وغیرہ۔

راجہ گج سنگھ: راجہ سورج سنگھ راٹھور کالڑکا تھا جو موٹا راجہ اودے سنگھ کالڑکا تھا اس کی بہن جگت گسائیں کے لطن سے شہزادہ خرم تھا اسی لیے شاہی دربار میں اس کے لڑکے راجہ گج سنگھ کی بڑی پذیرائی ہوئی وہ اپنے باپ کے ساتھ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا اس کے مرنے کے بعد چودہویں سال جلوس جہانگیری میں تین ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کے منصب اور راجہ کے خطاب سے سرفراز ہوا، سولہویں سال جلوس میں چہار ہزاری و سہ ہزار کا منصب پایا، ۱۸ویں سال جلوس میں شہزادہ خرم کے خلاف دکن بھیجا گیا اسی سال منصب پنج ہزار و چہار ہزار سوار سے سر بلند کیا گیا پھر مالوہ میں بھی شاہی خدمت کے لیے متعین رہا، شاہ جہانی عہد میں بھی اس کا عروج رہا۔ (تزک جہانگیری ص ۳۳۱، ۳۶۹ آثار الامراء، ج ۲ ص ۲۲۳)

سنیاسیوں سے جہانگیر کی عقیدت: دربار سے ہٹ کر ہندو سنیاسیوں اور جوگیوں سے جہانگیر کی پر کیف ملاقاتوں کا حال معلوم کر کے بھی اس کی روادارانہ دل دہی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اس کے زمانہ میں ایک سنیاسی چھدروپ اسرم نامی اجین کے پاس آبادی سے دور ایک جنگل میں رہتا تھا، جنگل میں ایک چٹان تھی اس میں اس نے ایک سوارخ کر لیا تھا جو ساڑھے پانچ گرہ لمبا اور ساڑھے تین گرہ چوڑا تھا وہ سانپ کی طرح اس سوارخ کے اندر چلا جاتا تھا جانے میں پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو لمبا کرتا تھا پھر سر کے بل سوارخ کے اندر رینگ جاتا، اسی طرح باہر نکل آتا وہ سوارخ کے اندر پڑا رہتا اس میں نہ بوریا اور نہ گھاس ہوتی، گرمیوں میں اس کو ہوا کی بھی پرواہ نہ ہوتی اسی طرح جاڑوں میں آگ کی گرمی کا بھی

خواہاں نہ ہوتا، آدھ گز سوتی کپڑے سے اپنا ستر ڈھانکے رہتا، سوراخ سے نکل کر دو مرتبہ دریا پر جا کر غسل کرتا اور پینے کے لیے پانی پیتل کے ایک برتن میں لیتا آتا، شہرا جین میں اس نے سات گھر منتخب کر لیے تھے جہاں روزانہ ان ساتوں کے دروازے پر جا کر فقیر کی طرح کھڑا ہو جاتا وہ لوگ اس کی ہتھیلی پر پانچ لقمے رکھ دیا کرتے تھے وہ ان کو حلق میں رکھ کر نگل جاتا تا کہ وہ لقبوں سے لذت آشنا نہ ہو ان گھروں میں کوئی عورت ایام سے ہوتی یا وہاں کوئی بچہ ہوتا یا کسی کی دعوت رہتی تو وہاں نہ جاتا وہ سرب کے لقب سے یاد کیا جاتا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو سب کچھ ترک کر چکا ہو، جہانگیر اپنے گیارہویں سال جلوس میں اُجین میں تھا تو اس کو اس سنیاسی سے ملنے کا اشتیاق ہوا، اس کی قیام گاہ تک کا راستہ بڑا دشوار گذرا تھا کوئی سواری نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن جہانگیر تین میل پاپادہ چل کر وہاں پہنچا، چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ:

”وہ علم سے خالی نہیں ہے، علم بیدانیت جو کہ علم تصوف ہے وہ خوب سمجھے

ہوئے ہے، چھ گھڑی تک اس کی صحبت میں رہا بڑی اچھی باتیں ہوئیں جس سے

میرے اوپر بہت اثر پڑا“۔ (۱۷۷-۱۷۶)

جہانگیر اپنے تیرہویں سال جلوس میں بھی اس سے جا کر ملا اس ملاقات کا ذکر

اپنی تزک میں اس طرح کرتا ہے:

”دوسری بار جدروپ کی صحبت کا شوق پیدا ہوا، ظہر کی نماز کے بعد کشتی میں

سوار ہوا اسکی ملاقات کو چلا دن کے آخر میں اس کے گوشہ تنہائی میں اس کو دیکھا

اس سے صحبت رہی اس کے حقائق و معارف کی بہت سی اونچی باتیں سنیں،

بلا مبالغہ اس نے تصوف کی بہت سی باتیں واضح کر کے بتائیں، اس کی صحبت

سے بڑا حظ حاصل ہوتا ہے اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی جب وہ بائیس سال کا

تھا تو اس نے تمام ظاہری تعلقات کو ختم کر کے شاہراہ تجرید میں قدم رکھا اب

اڑتیس سال ہوتے ہیں کہ بے لباسی کے لباس میں زندگی بسر کر رہا ہے جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں بھگوان کا شکر ادا کروں کہ ایسے عدل پسند بادشاہ کے عہد میں بہت ہی آرام اور سکون سے اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت میں مشغول ہوں اور میری عزیمت میں کسی قسم کا غبار نہیں پڑنے پایا ہے۔ (تزک جہانگیری ص ۵۵-۵۴)

کچھ دنوں کے بعد وہ سنیا سی اجین سے متھرا چلا گیا، جمننا کے کنارے رہ کر اپنی ریاضت میں مشغول ہو گیا جہانگیر اپنے چودہویں سال جلوس میں متھرا گیا تو اس سے پھر ملا، اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اس کی ذات بڑی غنیمت ہے اس کی مجلس سے بہت محفوظ اور مستفید ہوا۔ (ص ۲۸۲)

ایک ملاقات سے سیر نہیں ہوا تو اس کے پاس پھر گیا لکھتا ہے:

”گسامیں جدروپ سے پھر ملنے کی خواہش ہوئی بے تکلفانہ طور پر اس کے بھٹ کے پاس چلا گیا صحبت رہی اونچی باتیں سننے میں آئیں، حق جل و علانے اس کو عجیب توفیق عطا کی ہے اس کی فہم عالی ہے، فطرت بلند ہے، ادراک تیز ہے، اس کی دانش خداداد ہے، اپنی جمعیت کی خاطر ہر قسم کے تعلقات سے آزاد کر رکھا ہے، دنیا و مافیہا سے پیٹھ پھیر لی ہے مستغنی اور بے نیاز ہو کر تجرد کے گوشہ میں بیٹھ گیا ہے اس کے دنیاوی سامان میں آدھ گز پرانا کپڑا اور مٹی کا ایک برتن ہے جس سے وہ پانی پیتا ہے، گرمی، جاڑے اور برسات میں عریاں رہتا ہے، بڑی محنت سے ایک سوراخ بنایا ہے جس میں ایک شیر خوار بچہ بھی مشکل سے جاسکتا ہے، وہیں وہ رہتا ہے حکیم سنائی کے یہ اشعار اس کے حسب حال ہیں:

داشت لقمائیکے کرتبے تنگ چوں گلوگاہ نامی وسینہ جنگ



بوالفضولے سوال کردازوے چستیں خانہ شش بدست و دپے

بادم گرم و چشم گریاں پیر گفت ہذا لمن یموت کثیر

متھرا سے رخصت ہوتے وقت جہانگیر پھر اس سے ملنے گیا اس پر الوداعی ملاقات شاق گذری لکھتا ہے ”گسائیں کی ملاقات کے لیے پھر گیا اس سے وداع ہوا تو اس کی جدائی طبیعت پر بہت گراں گذری“۔ (ص ۲۸۳)

ماثر الامرا کے مصنف کا بیان ہے کہ جہانگیر کے دل پر اس سنیا سی کی باتوں کا بہت اثر ہوتا تھا وہ جس کسی کے لیے جہانگیر سے کچھ کہہ دیتا تو جہانگیر ضرور مان لیتا، اسی زمانہ میں خاں اعظم کو کہ سلطان خسرو کی طویل اسیری سے بہت پریشان تھا وہ سنیا سی کے پاس گیا اور اس سے خسرو کی رہائی کے لیے بادشاہ سے سفارش کرنے کی درخواست کی سنیا سی نے جہانگیر سے باتیں کیں تو وہ خسرو کے جرم کو معاف کر دینے کے لیے تیار ہو گیا اس نے حکم دیا کہ وہ کورنش کے لیے آسکتا ہے یہ مشکل کام اس بے غرض سنیا سی کے توسط سے بہت آسان ہو گیا۔

ماثر الامرا ہی میں ہے کہ جہانگیر کے ہم زلف حاکم بیگ یعنی نور جہاں کی بہن کا شوہر متھرا بھیجا گیا تو وہ اس سنیا سی کے یہاں لوگوں کا بہت ہجوم دیکھا کرتا تھا اس سے حکومت کے کاموں میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، حاکم بیگ کو یہ پسند نہ آیا اس لیے ایک روز سنیا سی سے بہت ناروا سلوک کیا، جہانگیر نے اپنی محبوب بیگم کے رشتہ کا مطلق خیال نہ کیا اور حاکم بیگ کو اس کے عہدہ سے برطرف کر دیا اس کا منصب اور اس کی جاگیر ضبط کر لی۔

(ماثر الامرا، ص ۷۶-۷۵)

راجپوت بیویوں سے جہانگیر کی قلبی محبت: جہانگیر کی شادیاں راجپوت شہزادیوں سے محض ہوا وہوس کی خاطر نہیں ہوتی رہیں وہ ان سے بڑی محبت سے پیش آتا رہا ممکن ہے کہ دربار کے راجپوتوں کی دل داری اور دل جوئی میں سیاسی مصلحتوں کا خیال رہا ہو لیکن حرم سرا

کے اندر تو سیاسی مصلحتوں کے بجائے ازدواجی تعلقات اور قلبی کیفیتیں کار فرما رہیں جن سے اس کی رواداری اور محبت کا اور بھی زیادہ اندازہ ہو سکتا ہے، اس کی پہلی شادی راجہ بھگوان واس کی لڑکی مان بانی سے ہوئی جو شاہی محل میں آ کر شاہ بیگم کہلائی، وہ تیس سال تک جہانگیر کی رفاقت کرتی رہی اس سے ایک لڑکی سلطان بیگم اور ایک لڑکا خسرو پیدا ہوا، مان بانی کو سلیم سے بڑی محبت نہیں بلکہ عشق رہا، خسرو جوان ہوا تو اس کو خود اکبر کی جانشینی کا سودا پیدا ہو گیا اس نے اپنے باپ جہانگیر سے بغاوت کی مان بانی کو اس سے بڑا دکھ پہنچا اس کے دماغ کا توازن بگڑ گیا اور ایفون کھا کر جان دے دی، جہانگیر کو بھی اس سے بڑی محبت الفت رہی، مرزا ہادی اقبال نامہ جہانگیر میں لکھتا ہے کہ حرم کی بیگمات میں سے جہانگیر کو سب سے زیادہ اسی سے انس و محبت تھی جہانگیر اپنی تزک میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”اس کی خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں انتہا ہی عقلمند تھی، میرے ساتھ اس کا اخلاص اس درجہ تھا کہ وہ اپنے ہزار لڑکوں اور بھائیوں کو میرے ایک بال بیکا ہونے پر قربان کر دینے کے لیے تیار رہی جب خسرو نے سرکشی کی تو اس نے خسرو کو بارہا لکھا اور میری محبت اور اخلاص کی طرف مائل کیا لیکن جب دیکھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے اور انجام معلوم نہیں کہ کیا ہو، تو غیرت کے مارے جو راجپوت عورتوں کی طبیعت کا خاصہ ہے اپنی جان کھودینے کا تہیہ کیا جن دنوں میں شکار کے لیے گیا ہوا تھا، ۲۶ رزی الحجہ ۱۰۱۳ ہجری کو عین شورش دماغ میں اس نے بہت سی مقدار میں ایفون کھالی اور تھوڑی دیر میں چل بسی۔“

اس کی موت پر جہانگیر کو بڑا دکھ پہنچا اس کی یاد میں بے چین اور بے قرار رہا، لکھتا ہے:

”اس کی موت سے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھ پر بڑا سخت وقت گذرا، زندگی کی کسی قسم کی کوئی لذت میرے لیے باقی نہیں رہی، چار رات دن جس کے بتیس پہر ہوتے ہیں انتہا درجہ کارنج و اندوہ رہا، کھانے پینے کی کوئی چیز منہ

میں نہ گئی، میرے والد بزرگوار کو یہ حال معلوم ہوا تو بڑی شفقت و محبت سے دلاسا کا خط لکھا، خلعت اور مبارک پگڑی سر سے جس طرح اتاری تھی اسی طرح بندھی ہوئی میرے لیے بھیجی میرے سوز و گداز کی آگ پر اس عنایت سے پانی پڑ گیا اور میرے اضطراب اور اضطراب میں قرار پایا۔

(ترک جہانگیری ص ۲۷-۲۵)

مولانا شبلیؒ اس واقعہ کی تفصیل لکھ کر آخر میں رقم طراز ہیں:

”بے شبہہ تیموریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ اقلیم دل کو فتح کر لیا تھا

اور ہندوؤں کے اخلاص و محبت نے فاتح کو مفتوح بنا لیا تھا:

بہ لوح مشہد پروانہ این رقم دیدم کہ آتشے مرا سوخت خویش را ہم سوخت

ہندو علم و ادب سے جہانگیر کی دل چسپی: جہانگیر اپنی رواداری میں فارسی زبان کے شعرا کے ساتھ سنسکرت اور ہندی کے عالموں اور کوئیوں کی بھی سرپرستی کرتا رہا، سنسکرت کا ایک بڑا عالم شری کرشن جہانگیر کا بڑا معتمد علیہ تھا اس نے بھاسکر آچاریہ کے الجبرا کی ایک شرح پنچونکور کے نام سے لکھی، سنسکرت کے ایک شاعر رودرنے جہانگیر کی سرپرستی سے متاثر ہو کر ایک مدحیہ نظم نواب خاں چرت لکھی، جس میں جہانگیر کی تعریف ہے اسی نے اکبر کے دوسرے بیٹے شہزادہ دانیال کی شان میں دانا شاہ چرت کے نام سے ایک مدح لکھی اس کی ایک مدح جہانگیر کے لڑکے شہزادہ خرم کے لیے بھی ہے اس کا نام سملاسہ ہے۔

(سنسکرت مسلمانوں کی سرپرستی میں از گنڈے راؤ ہرکارے، اسلامک کلچر حیدرآباد دکن

اکتوبر ۱۹۵۲ء)

جہانگیری دور میں ہندوؤں کے علوم سے مسلمانوں کی دل چسپی: جہانگیر کے دربار

کے ہندو شعرا میں کیشو مسرا اور پوکھر کے نام ملتے ہیں اس دور میں رواداری کو جو فضا پیدا ہوئی

تو مسلمانوں نے ہندوؤں کے علم و ادب سے کافی دل چسپی لی، شیخ سعد اللہ نے رامین کو

فارسی میں منظوم کیا اور اس کا نام رام دستیار رکھا، (مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری جلد اول کالم ۱۰۹۸) صوفی شریف نے یوگ و شنت کا خلاصہ فارسی میں ”اطوار در حل اسرار“ کے نام سے کیا اور یہ جہانگیر کے نام سے معنون ہوئی، (مخطوطات فارسی برٹش میوزیم لائبریری ج ۳ ص ۱۰۳۳) عبدالشکور بزمی نے ۱۶۱۷ء میں پدمات کا ترجمہ فارسی میں کیا، (صبح گلشن مؤلفہ علی حسن خاں، ص ۶۲) مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ نے اختیارات قاسمی یا دستور الاطبا کے نام سے طب پر ایک کتاب لکھی تو اس میں ہندوستانی ادویات اور طرز علاج سے استفادہ کیا، (مخطوطات فارسی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، مرتبہ ایونو، ۱۹۲۳ء) فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ہندوؤں کے بعض مذہبی عقائد کا بھی ذکر رواداری کے ساتھ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ پرانے برہمنوں کے قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے ایک انتہا معین ہے اور قیامت کا آنا برحق ہے بعد کے ہندو پنڈتوں نے دنیا کو اس کی قدامت کے لحاظ سے چار دوروں میں تقسیم کیا ہے، پہلے دور کا نام ست یگ رکھا ہے جس کی مدت سترہ لاکھ بیس ہزار سال مشہور ہے اس زمانہ میں شریف، رذیل، فقیر اور دولت مند کسی شخص کا قدم سیدھی راہ سے نہیں ہٹا اور ہر شخص کا فعل مرضی الہی کے موافق ہوتا تھا، دوسرے دور کا نام ترتا یگ ہے جس کی مدت بارہ لاکھ چھپانوے ہزار سال مشہور ہے اس دور میں صرف تین چوتھائی انسانی آبادی کے افعال مرضی الہی کے موافق تھے، تیسرے دور دو پر یگ ہے جس میں آبادی کے نصف حصہ میں سچائی تھی، چوتھا دور کل یگ ہے اس کی مدت چار لاکھ تیس ہزار سال بتائی جاتی ہے اس زمانہ میں انسانی آبادی کے تین حصے صراط مستقیم سے ہٹ گئے۔

فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہل ہند اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ خدا نے سب سے پہلے پانچ عنصر پیدا کیے، خاک، آتش، آب، باد اور آکاش، اس کے بعد برہما کو جو طبعاً تجرد اور دانش کے اوصاف سے متصف تھے، عالم وجود میں لا کر اس ذات کی خلقت کو تمام ماسویٰ کی پیدائش کا وسیلہ اور ایجاد عالم کا سبب قرار دیا، برہما نے خدا کے حکم سے انسان کو عدم سے

وجود میں لا کر ان کو چار قسموں میں تقسیم کیا، برہما ہی نے الہامی تائید اور تعلیم سے مستفید ہو کر ایک کتاب دنیا اور آخرت کے فوائد کے لیے مرتب کی جس کو وید کہتے ہیں، اپنے وہی علم سے ایسے قوانین بنائے جن کے ذریعہ سے انسان دنیا کی ہر چیز سے وابستہ رہ کر بھی خدا کو نہ بھولے اسی کو ہر چیز میں دیکھے اور مخلوقات کا انتظام خوبی سے انجام پائے، وید میں ایک لاکھ اشلوک چار چرن سے بنتا ہے اور چرن ایک اچھر سے کم اور چھبیس اچھر سے زیادہ نہیں ہوتا، اچھر صرف حرف کو کہتے ہیں یا ان دو حرفوں کے مجموعے کا نام ہے جس کا دوسرا حرف ساکن ہو۔

فرشتہ نے اپنے کتاب میں مہا بھارت کے پورے حصہ کا بھی تجزیہ کیا ہے اس کے مرتب ویاس کے بارے میں لکھا ہے کہ اہل ہند حکیم ویاس کو پاک نفس اور عارف کامل سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ویاس زندہ جاوید ہے، بعض ہندو فاضلوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک زمانے میں ایک شخص انسانی گروہ کے اخلاق و احوال کی اصلاح کے لیے ظاہر ہوتا ہے اور اسی شخص کو ویاس کہتے ہیں۔ (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۵-۶)

اس دور میں ہندی شاعری سے بھی مسلمانوں نے پوری دل چسپی لی، عثمان کی مشہور تصنیف چتر اولیٰ ۱۶۱۳ء میں لکھی گئی جس میں پدمادت کے اندازہ کی تمثیلیں اور مسائل ہیں، (ہسٹری آف ہندی لٹریچر، از رام اودھ تریدی ص ۴۸، رسالہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۵ء ص ۲۸۸) اسی دور میں قصبہ منو کے شیخ نبی ہندی کے مشہور شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے گیان دیپ کے نام سے ایک اعلیٰ پایہ کی صوفیانہ عشقیہ کہانی لکھی، (ہسٹری آف ہندی لٹریچر از رام اودھ تریدی، ص ۴۲) اسی عہد میں نعمت خاں بھی ہندی کا ایک پرگو شاعر گذرا ہے، اس کی تصانیف کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے جن میں سے اکیس کا شمار پریم گاتھاؤں میں کیا جاتا ہے یہ اتر پردیش کی ہندوستانی اکیڈمی میں موجود ہیں، ایک مسلمان ہندی شاعر ظاہر نے ۱۶۲۰ء میں ایک کتاب کوک سار لکھی۔ (پنجاب میں اردو ص ۱۱۷)

جہانگیر ہی کے عہد میں احمد نے ہندی میں اپنی کتاب سامدریکا لکھی تو اس کی ابتدا گنیش وینمہ سے کی اسی طرح احمد اللہ وکشنا نے اپنی تصنیف نایکا بھید میں شری رام جی، سرسوتی اور گنیش جی کے نام ملتے ہیں، یعقوب نے راشن بھوشن لکھی تو اس میں شری گنیش، سرسوتی رادھا کرشن اور گوری شکر کے فضل و رحمت کا طالب ہوا ہے (خطبہ صدارت ڈاکٹر تارا چند، مغل ہسٹری سیکشن، انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۳۹ء کلکتہ ص ۱۷) راسخ علما اس قسم کی علمی رواداری کو پسند نہ کرتے لیکن علما کی دارو گیر کا خیال کیے بغیر ہر زمانہ میں کچھ ایسے شاعر اور مصنف ہوئے جو اس قسم کی رواداری کا اظہار کرتے رہے۔

جہانگیر کی مذہبی فراخ دلی کا اعتراف: جہانگیر کی فراخ دلی اور رواداری کی تعریف مسلمان اور ہندو دونوں مورخین نے کی ہے، مثلاً مولانا شبلی رقم طراز ہیں:

”اکبر اور جہانگیر کی پالیسیاں گو متحد المقصد تھیں لیکن ایک نہایت اہم فرق تھا اس امر میں دونوں متفق تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں اور دونوں پر یکساں حکومت کرنا فرض سلطنت ہے لیکن اکبر کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لیے مذہبی جوش اور اثر کا رنگ ہلکا کرنا ضرور ہے اس لیے وہ ہندو، عیسائی، پارسی اور تمام مذہبوں کا ظاہری قالب اختیار کرتا رہتا تھا وہ صبح کو سورج پر پانی چڑھاتا تھا شام کو چراغ جلے آگ کی تعظیم کرتا تھا، حضرت عیسیٰ اور مریم کی تصویروں کے آگے سر جھکاتا تھا لیکن جہانگیر سمجھتا تھا کہ پکا مسلمان، پکا متعصب، پکا دیندار رہ کر بھی غیر مذہب والوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیے جاسکتے ہیں اس بنا پر وہ ایک طرف تو پندتوں سے مذہبی مباحثہ کر کے ان کو قائل کرتا ہے ایک ہندو راجہ کو ہدایت و تلقین نہ بہ جبر مسلمان کرتا ہے کوٹ نگر فتح کر کے اسلامی شعار جاری کرتا ہے اس پر ناز کرتا ہے، دوسری طرف راجہ مان سنگھ کو جنگالہ کا گورنر کر کے پچاس ہزار فوج کا افسر مقرر کرتا ہے، راجہ جگناتھ کو پنج ہزاری منصب کے ساتھ خلعت اور مرصع تلوار عنایت کرتا ہے رانا شکر کو جو مہارانا اودے کا چچا زاد بھائی تھا خلعت دے کر اودے پور کی مہم پر بھیجتا ہے،

پیرداس کی بکرناجیت کا خطاب اور میر آتشی کا عہدہ دے کر پچاس ہزار توپچیوں کا افسر مقرر کرتا ہے، شیخ عبدالحق دہلوی کی جس طرح تعظیم و تکریم کرتا ہے جدروپ گسائیں کے ساتھ اسی اعزاز، خلوص اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے، اس کی تمام تاریخ میں ایک واقعہ بھی منقول نہیں کہ اس نے مذہب کی بنا پر ملکی حقوق کی تفریق کی ہو اس نے اکبر کی پالیسی کی مداحی ان لفظوں میں کی ہے اور اس حد تک خود پیر و تھا "ان کے ممالک محروسہ میں" جو دریائے شور پر جا کر ختم ہوتے تھے، مختلف ملتوں کے عقیدوں کی جگہ تھی خواہ وہ صحیح یا ناقص ہوتے، تعریض کی تمام راہیں بند تھیں ایک مسجد میں شیعہ و سنی اور ایک کلیسا میں فرنگی اور یہودی عبادت کرتے تھے۔

”زیمین عشق بہ کونین صلح کر دیم“۔

(مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۱۸-۱۱۷)

ڈاکٹر بنی پرشاد (سابق پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی) نے انگریزی میں ہسٹری آف جہانگیر لکھی ہے جو عام طور سے بہت پسند کی گئی اور مقبول ہوئی اس میں وہ لکھتے ہیں:

موجودہ دور کے بعض اہل قلم (مراد انگریز مورخین) نے جہانگیر کو سنگدل، غیر متوازن، ظالم، شراب خوار اور عیاش بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسی رائے انصاف اور صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں ہے اس کی شہرت اس کے باپ کے غیر معمولی کارنامے اور اس کے بیٹے شاہ جہاں کی شان و شوکت کے سامنے ماند پڑ گئی ہے اس کی شہرت کو تاریخ کی جعلی باتوں اور سیاحوں کے قصوں سے بھی نقصان پہنچا ہے، اس کا مطالعہ ادھر ادھر کی عبارتوں کے سہارے کیا گیا ہے اگر اس کی زندگی کے پورے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ بڑا ہی باشعور اور رحم دل تھا اس کو اپنے خاندان کے لوگوں سے گہرا تعلق رہا اور تمام لوگوں کے لیے فیاض تھا، ظلم سے نفرت کرتا اور انصاف کے لیے بے چین رہتا اس کی شاہزادگی اور بادشاہت کے زمانہ میں کچھ مثالیں ایسی ضرور ملیں گی کہ اس نے غصہ میں آکر وحشیانہ مظالم

کیے لیکن ایسے موقع پر بھی اسے اشتعال دلایا گیا تب ہی وہ ناروا حرکتیں کر بیٹھا لیکن عام طور سے اس میں بڑی انسانیت، مروت اور دست کشائی رہی اس کے مذہبی خیالات اس کے معاصروں اور بعد کی نسلوں کیے لیے معما بنے، کچھ لوگ تو اس کو ملحد، کچھ وسیع المشرب، کچھ راسخ العقیدہ مسلمان اور کچھ عیسائی، کچھ تو ہم پرست اور کچھ تمام مذاہب کا تمسخر اڑانے والا سمجھتے رہے، درحقیقت وہ گہرے قسم کے مذہبی خیالات سے عاری رہا وہ اپنی روشن خیالی کی وجہ سے محض عقیدے، مسلک یا توہمات کی بنا پر کسی مذہبی خیال سے مطمئن ہونا پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ خدا کا قائل تھا زندہ اور مردہ اولیا اللہ کا معتقد تھا، ہندو اور مسلمان دونوں کے خدا رسیدہ بزرگوں کا احترام کرتا تھا، ہندومت کے اوتار کے عقیدہ کو ایک بیکار قسم کا خیال سمجھتا تھا، اس کی سلطنت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقوں میں جو مذہبی اصلاحیں ہوتی رہیں ان سے اس کی واقفیت نہیں رہی، اس کو خدا کے تصور، بزرگان دین کے احترام اور مذہبی مراسم کی پابندی کرنے میں پوری تسلی ہو جاتی وہ ذہنی طور پر تصوف اور ویدانت دونوں کا قائل تھا، اسی لیے وہ جدروپ اور دوسرے سادھوؤں سے بھی مل کر ان سے باتیں کرتا۔

مذہب کے متعصب مبلغوں کو وہ ملک کے معاشرتی اور سیاسی نظام کے لیے خطرناک سمجھتا تھا اسی لیے ان سے سختی سے پیش آتا اس نے سکھوں کے چوتھے گروارجن کو قتل کرادیا اسے اس کی مذہبی ایذا رسانی ضرور قرار دی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں، یہ فعل سراسر سیاسی اسباب کی بنا پر تھا وہ سکھوں کے مذہب سے بدظن ضرور رہا لیکن اس نے ان کو مذہب کی بنا پر ایذا نہیں پہنچائی، اس نے شیخ احمد سرہندی اور شیخ ابراہیم بابا کو گوالیار کے قید خانے میں بند کر دیا تھا لیکن اس بے انصافی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اثرات افغانوں اور دوسرے مسلمان مریدوں پر زیادہ پڑ رہے تھے اس نے گجرات میں شیو تمبر جینیوں کے خلاف بھی احکام جاری کیے جو اس لیے عمل میں آئے کہ ان کے ایک گرو مان سنگھ نے شہزادہ خسرو کی بغاوت کے موقع پر دو سال کے اندر جہانگیر کی حکومت کے زوال کی پیشن گوئی کا اعلان کیا



تھا پھر ان جینیوں کے مکانات کے متعلق شہرت پھیل گئی تھی کہ وہ بغاوت اور بد اخلاقی کے اڈے بن گئے ہیں جب تحقیق کے بعد یہ بات غلط نکلی تو احکام واپس لے لیے گئے۔

جب وہ تخت نشین ہوا تو اس کے حامیوں نے اس سے اسلام کے وقار کو بلند کرنے کا وعدہ کیا اسی لیے تخت نشینی کے بعد شروع کے چند مہینوں تک اس نے کچھ لوگوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا لیکن خود ذاتی طور پر اس کو یہ بات پسند نہ رہی کچھ دنوں تک عیسائی مشنریوں سے ملنے میں گریز کرتا رہا پھر بہت جلد ان کو اپنی پرانی عنایتوں سے نوازنے لگا، اس نے دو ارمینی عیسائی لڑکوں کا ختنہ بھی زبردستی کرا دیا لیکن پھر بہت جلد ان کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی اجازت بھی دے دی اس نے عیسائی مبلغوں کو اپنی سلطنت میں تبلیغ کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی اس نے اپنے سکوں پر کلمہ ضرور نقش کرایا لیکن ایسے سکے صرف دو تین سال تک جاری رہ سکے اگر چند مثالوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مذہبی پالیسی مکمل رواداری پر مبنی تھی اس نے اپنی تزک میں صلح کل کی پالیسی کی تعریف کی ہے اور اسی پر عمل کرتا رہا جیسا کہ اس کے باپ نے کیا تھا یہ جہانگیر کی مذہبی غیر رواداری پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ (ہسٹری آف جہانگیر ۱۸۳۰ء ایڈیشن باب ۳۳)



## شاہ جہاں

شاہ جہاں ایک راجپوت شہزادی جگت گسائیں معروف بہ بلقیس زمانی کے بطن سے تھا اس کی زندگی پر راجپوت تہذیب و تمدن کا نمایاں اثر ہونا چاہیے تھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ جہانگیر سے بھی زیادہ راسخ العقیدہ مسلمان ہو اس کے پہننے اوڑھنے، رکھ رکھاؤ اور زندگی کے کسی شعبہ میں بھی راجپوتوں کا اثر نہیں پایا جاتا بلکہ اس نے جس شان کی مسجدیں بنوائیں یا جو بھی عمارتیں تعمیر کرائیں ان پر قرآنی آیتیں کندہ کرانے کا وہی اہتمام کیا جو ایک بہت ہی راسخ عقیدہ مسلمان حکمراں کر سکتا ہے اس نے اپنی اور نہ اپنے کسی شہزادہ کی شادی کسی راجپوت شہزادی سے کی، راجپوت راجاؤں کے حرم میں بکثرت بیویاں ہوا کرتی تھیں، اس کے حرم میں ایک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں رہیں پھر وہ صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند رہا بلکہ نماز باجماعت ادا کرنے کو کوشش کرتا جب اورنگ زیب نے اس کو آگرہ کے قلعہ میں نظر بند رکھا تو اس کے لیے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی بنوادی تاکہ وہ اپنے آخر وقت میں زیادہ تر یاد الہی میں مصروف رہے، معاصر تاریخوں میں تو نہیں لیکن بعد کے تذکروں میں ہے کہ اس کا بچپن حضرت مجدد الف ثانی کی صحبت میں گذرا اور وہ ان کا مرید بھی ہو گیا تھا، (خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۶۱۳) شاید یہ مذہبی اثر ان ہی کی صحبت کی وجہ سے اس کے دل میں منقوش ہو گیا ہو اس کی ابتدائی تعلیم بھی اچھی رہی، قاسم بیگ تبریزی، حکیم ودائی گیلانی، شیخ ابوالخیر (برادر علامی ابوالفضل) اور وجیہ الدین گجراتی جیسے باکمال استاذ اس کی تعلیم کے لیے

مقرر تھے، (تفصیل کے لیے دیکھو بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۵۵) اپنے درباری مشاغل کے ساتھ وہ روزانہ کتابوں کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا، رات کو سونے جاتا تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھا کرتے تھے جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء، سلاطین کی سوانح عمریاں اور تاریخیں ہوتیں، اس مطالعہ کی وجہ سے بھی اس میں مذہبیت پیدا ہوئی۔

اس مذہبیت کے باوجود اس کا دل ہندوؤں اور خصوصاً راجپوتوں کے لیے بڑا نرم تھا بلکہ ان سے محبت سے پیش آتا رہا اور یہ فطری تقاضا بھی تھا کیوں کہ اس کے سارے نانہالی رشتہ دار راجپوت ہی تھے اسی راجپوت سرداروں کے دلوں میں بھی اس کی بڑی عزت رہی، اس نے اپنی شہزادگی میں جب جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو اس کا حلیف راجہ گوپال داس گوڑ تھا، جہانگیر کی فوج نے اس کا تعاقب کیا تو راجہ گوپال داس اور اس کا بیٹا بلرام شہزادے کے ساتھ سایے کی طرح رہے، راجہ گوپال داس آگے چل کر شاہ جہانی عہد میں ٹھٹھ کے محاصرہ میں اپنی بہادری اور شجاعت کا جو ہر دکھا کر اپنے بیٹے بلرام کے ساتھ حق نمک ادا کرتے ہوئے فدا ہو گیا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۲۵)

وہ جب تخت پر بیٹھا تو اس کو اپنے راجپوت سرداروں پر اتنا بھروسہ رہا کہ اس کی جان کے محافظوں کا سردار راجہ مہیش داس راٹھور اس کے تخت کے پیچھے برابر کھڑا رہتا سفر میں بھی وہ برابر اس کے ساتھ ہوتا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۴۳۶)

وہ بڑی فیاضی سے راجپوت اور ہندو سرداروں کے عہدے دے کر نوازتا رہا اس کے عہدیداروں میں ہندو معزز ترین منصب داروں میں تھے اس نے ہندوؤں کو اپنی سلطنت کا وکیل یعنی وزیر اعظم اور دیوان تن یعنی نائب وزیر اعظم بنانے میں بھی تامل نہیں کیا جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے اندازہ ہوگا۔

رائے ریان دیانت رائے گجراتی: قوم کا برہمن اور وطن گجرات تھا شاہ جہاں کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کیا، ۱۱ جلوس میں دیوان تن (نائب اول وزیر اعظم) مقرر ہوا، ۱۲

جلوس میں افضل خاں کی وفات کے بعد رائے رایان کا خطاب ملا اور کچھ دنوں وکیل، یعنی وزیراعظم رہا، ۱۵ جلوس میں دیوان بیونات ہوا پھر کل صوبہ دکن کا دیوان مقرر کیا گیا۔

(بادشاہ نامہ ۱۰۵-۱۳۲-۱۳۳-۲۰۱-۲۴۳-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۳۲۲-۷۳۷)

رائے رایان راجہ گھناتھ واس سعد اللہ خانی: شاہ جہاں کے وزیراعظم نواب سعد اللہ خاں کے یہاں متصدی تھا لیکن ترقی کر کے شاہ جہاں کے دربار میں پہلے دیوان تن ہوا پھر خالصہ شاہی کی دیوانی ملی، نواب سعد اللہ خاں کی وفات کے بعد رائے رایان کا خطاب ملا اور دیوان اعلیٰ کا کام اس کے سپرد ہوا، ۱۰۶۸ء میں کل دیوانی کا کام انجام دینے لگا، سموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہو گیا جس نے اس کا پورا اعزاز قائم رکھا اورنگ زیب اس کی دیانت اور کارگزاری سے متاثر رہا، ۱۰۷۳ ہجری میں عالمگیر کے ساتھ کشمیر کے راستہ میں وفات پائی۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۸۲)

مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور: جودھ پور کے راجہ گنج سنگھ راٹھور کا چھوٹا بیٹا تھا، ترقی پا کر شاہ جہانی دربار کا بہت ہی معزز منصب دار ہوا حتیٰ کہ ۱۰۵۴ ہجری میں عارضی طور سے دارالسلطنت اکبر آباد کی حکومت بھی عطا ہوئی، ۲۹ جلوس میں شش ہزاری، شش ہزار سوار، پنج ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ کا منصب اور مہاراجہ کا خطاب پایا، شاہ جہاں کے آخر زمانہ میں داراشکوہ نے ہفت ہزاری ذات ہفت ہزار سوار، پنج ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ کا منصب اور مالوہ کی صوبہ داری عطا کر کے اس کو اورنگ زیب اور مراد کے خلاف جنگ کرنے کے لیے دھرمات بھیجا لیکن اورنگ زیب اور مراد نے اس کو شکست دی، سموگڑھ کی لڑائی میں اور داراشکوہ کی پسپائی کے بعد جسونت سنگھ عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو عالمگیر نے اس کو شاہی ملازمت سے منسلک کر لیا اور شہزادہ شجاع کے خلاف جنگ کرتے وقت اس کو فوج کے ایک بازو پر متعین کیا لیکن بڑے بڑے راجپوت سرداروں کے ساتھ لشکر گاہ کو لوٹ کر نکل بھاگا اور جودھ پور پہنچ کر ایک فوج تیار کی اور داراشکوہ کو جو اس وقت گجرات میں تھا لکھ بھیجا کہ وہ آگرہ پلٹ

آئے داراشکوہ نے گجرات میں ایک فوج تیار کر لی تھی، جسوقت سنگھ کی دعوت پر چل کھڑا ہوا لیکن اورنگ زیب نے اس کو اجمیر کے قریب پھر شکست دی اور جسوقت سنگھ کچھ کام نہ آسکا، اس لڑائی کے بعد اورنگ زیب کے دربار میں جسوقت سنگھ پھر حاضر ہوا اورنگ زیب نے اس کے قصوروں سے چشم پوشی کی اور گجرات کا صوبہ دار مقرر ہوا، ۴ جلوس عالمگیری میں شیواجی کے خلاف مہم پر گیا لیکن اس کی وفاداری مشکوک رہی اس لیے وہاں سے واپس بلا لیا گیا، ۹ جلوس میں جمرو و مضاف کابل کا حاکم مقرر ہوا اور وہیں وفات پائی۔

(مآثر الامراء، ج ۳ ص ۵۹۹)

راجہ جے سنگھ: یہ پنج ہزاری پنج ہزار سوار، دو ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپ کے منصب دار تھے۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۱۹)

راجہ جگت سنگھ: پنج ہزاری، پنج ہزار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۱۹)

راجہ بھٹل داس گوڑ: جہانگیر کے زمانہ میں اس کا باپ راجہ گوپال داس گوڑ اسیر کا قلعہ دار تھا، جہانگیر اور نور جہاں سے شہزادہ خرم کو اختلاف ہوا تو راجہ گوپال داس نے شہزادہ کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ سایہ کی طرح رہا اس کے لڑکے بھٹل داس کو شہزادہ خرم کے تخت نشین ہونے کے بعد بیس ہزار روپے نقد، خلعت، علم، اسپ اور فیل بطور انعام اور راجہ کا خطاب دیا، شروع میں سہ ہزاری ذات سوارو پانصد سوار کا منصب ملا، چھپار سنگھ بندیلہ اور خان لودی کی سرکوبی میں شریک رہا ۴ جلوس میں رن تھبور کا قلعہ دار ہوا، ۶ میں اجمیر کا فوجدار، ۸ میں اجمیر کا صوبہ دار اور ۱۱ میں اکبر آباد کا قلعہ دار اور ۱۴ میں اکبر آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا، ۲۱ میں صوبہ کابل میں متعین ہوا، بدخشاں اور قندھار کی مہم میں شریک رہا، ترقی کر کے آخر میں پنج ہزاری، پنج ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ کا منصب پایا۔

(مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۵۰ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲)

راجہ گنج سنگھ: راجہ گنج سنگھ بھی پنج ہزاری پنج ہزار سوار سے نوازے گئے۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۱۹)

بالوجی دکھنی: بالوجی دکھنی بھی پنج ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب دار تھا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۰)

راؤ امر سنگھ: راجہ گج سنگھ کا بیٹا تھا، چہار ہزاری سے ہزار سوار کا منصب پایا لیکن جنون کے

مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۱)

راجہ رائے سنگھ: مہاراجہ بھیم سنگھ سیسویہ کا لڑکا تھا، چار ہزاری دو ہزار سوار کے منصب پر

فائز تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۱)

ہمران دکھنی: چار ہزاری دو ہزار و پانصدی سوار کا منصب دار تھا، ۷۰ جلوس میں وفات پا گیا۔

راجہ روپ سنگھ راٹھور: مہاراجہ جسونت سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا، ترقی کر کے چہار ہزاری

ذات سے ہزار سوار کا منصب پایا اور پرگنہ ماندل گڑھ سرکار چتوڑ کی جاگیر پائی، دارا کی حمایت

میں اورنگ زیب کے خلاف اتنی بہادری سے لڑا کہ خود اورنگ زیب کو اس کے مارے

جانے پر افسوس رہا۔ (مآثر الامراء ج ۲ ص ۲۶۸)

راجہ امر سنگھ راٹھور: جودھ پور کے راجہ گج سنگھ راٹھور کا بڑا بیٹا تھا، چہار سنگھ بندیلہ کی سرکوبی

پر متعین ہوا، ۹ جلوس میں دکن کی مہم پر گیا، ۱۴ میں صوبہ کابل میں متعین ہوا، چار ہزاری سے

ہزار سوار کے منصب اور نقارہ رکھنے کی عزت پائی تھی، اورنگ زیب کے دربار سے بھی وابستہ

رہا۔ (مآثر الامراء ج ۲ ص ۲۳۰)

ستر سال ہاڈا: راؤرتن کا پوتا تھا ترقی کر کے ۲۲ جلوس میں سے ہزاری ذات سے ہزار سوار

کا منصب پایا آخر میں دارا شکوہ کا مشیر خاص ہو گیا تھا اور اسی کی حمایت میں سمو گڑھ میں بڑی

جرات اور پامردی سے لڑا لیکن مارا گیا۔ (مآثر الامراء ج ۲ ص ۲۶۰ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

کنندر سنگھ ہاڈا: مادھو سنگھ کا بیٹا تھا ترقی کر کے منصب سے ہزاری ذات دو ہزار سوار پر فائز

ہوا، دارا شکوہ کی خاطر دھرماوت کی جنگ میں قربان ہوا۔ (مآثر الامراء ج ۳ ص ۵۰۹)

مہیش داس راٹھور مہابت خانی: پہلے خانخاناں مہابت خاں کی سرکار میں نوکر رہا پھر

شاہجہانی دربار سے منسلک ہوا تو ترقی پا کر پرگنہ جالور کی جاگیر پائی پھر لاہور کا قلعہ دار مقرر ہوا اور آخر میں سہ ہزاری ذات دو ہزار پانصد سوار کا منصب پایا۔ (مآثر الامراء، ج ۳ ص ۴۴۵)

راوت رائے دکنی: سہ ہزاری ہزارو پانصد سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

اوداجی رام دکنی: سہ ہزاری دو ہزاری سوار کا منصب دار رہا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

راجہ انرودھ گوڑ: راجہ بھٹل داس گوڑ کا بڑا بیٹا تھا، اجمیر کی فوج داری پر مامور ہوا، ۲۵ جولوس میں راجہ کے خطاب کے علاوہ نقارہ رکھنے کی بھی اجازت ملی، رن تھنپور کا قلعہ دار بھی رہا، قندھار کی مہم پر بھی گیا، ۳۱ جولوس میں سہ ہزاری پانصدی ذات سہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب پایا۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۷۶)

بھرجی: بکلانہ (گجرات) کے ایک زمیندار خاندان سے تھا، ۱۲ جولوس میں سہ ہزاری ذات دو ہزارو پانصد سوار کا منصب پایا اور پرگنہ سلطان پور (گجرات) جاگیر میں پایا۔

(مآثر الامراء، ج ۱ ص ۴۱۳-۴۱۲ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ: راجہ نرسنگھ بندیلہ کا بیٹا تھا، مختلف قسم کی خدمات انجام دے کر برہان پور کا ناظم مقرر ہوا پھر ۲۲ جولوس میں جونا گڑھ کی حکومت پر تعینات ہوا، منصب سہ ہزاری ذات سہ ہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ پر سرفراز تھا۔

(مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۵۶ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

مادھو سنگھ ہاڈا: راورتن سنگھ ہاڈا کا بیٹا تھا، شاہ جہاں کے دربار سے منسلک ہوا تو خاں جہاں کی سرکوبی میں بڑے جنگی کارنامے انجام دیے اسی لیے شاہ جہاں نے اس کو منصب دو ہزار و پانصدی ذات دو ہزار سوار پر فائز کیا اور پرگنہ کوٹہ بلاتہ میں جاگیر دی پھر ۶ جولوس میں برہان پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، آخر میں بلخ کی قلعہ داری تفویض کی گئی، سہ ہزاری و سہ ہزار سوار کا منصب دار بھی ہوا۔ (مآثر الامراء، ج ۳ ص ۴۵۳ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

راجہ جگت سنگھ: راجہ باسو کا بیٹا تھا، سہ ہزاری دو ہزار سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۲)

راجہ منکو جی ہنالکروکئی: سہ ہزاری و ہزار پانصد سوار کا منصب دار تھا، ۱۰۳۹ ہجری میں شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔

رائے کاسنی واس: ہزاری دوصد و پنجاہ سوار کا منصب دار تھا، ترقی پا کر دار السلطنت لاہور کا دیوان پھر صوبہ کابل کا بخشی، ۲۰ جلوس میں دار السلطنت آگرہ کا دیوان اور آخر میں صوبہ بنگال کا دیوان مقرر ہوا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۶)

ہری سنگھ راٹھور: راجہ کشن راٹھور کا بیٹا تھا، ترقی کر کے ہزار و پانصدی سوار کا منصب پایا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۲۳۱)

باناجی دیوریہ: ۱۰۳۰ ہجری میں ملازمت شاہی میں داخل ہوا، دو ہزاری ہشت صد سوار

کا منصب پایا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۸)

گوپال سنگھ: راجہ متر دپ کچھواہہ کا بیٹا تھا، ہزاری ہزار سوار کا منصب دار ہوا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۲)

گوکل واس سیسودیہ: بلخ و بدخشاں کی مہم پر بھی گیا، ۲۰ جلوس میں منصب ہزار و پانصدی

ذات پایا۔

گوردھن راٹھور: اسیر کا قلعہ دار رہا، مہم قندھار پر بھی گیا ہشت صدی ذات چہار صد سوار

کا منصب پایا، دارا شکوہ کی حمایت میں دھرمات میں بہادری سے لڑا۔

رائے کنداس نارنولی: معمولی عہدہ سے ترقی پا کر ۱۰۵۲ ہجری میں دیوان تن ہو گیا۔

(آثر الامراء ج ۲ ص ۲۳۷)

بگرام کچھواہہ: بلخ اور بدخشاں کی مہم میں کارگزاری کے صلہ میں ہفت صدی ذات شش

صد سوار کا منصب پایا۔

چندر من بندیلہ: راجہ ز سنگھ دیو کا چھوٹا بیٹا تھا، ۸ جلوس شاہ جہانی میں اس کے بھائی چہار

سنگھ بندیلہ نے بغاوت کی تو وہ شاہ جہاں کی حمایت میں اپنے سگے بھائی سے لڑا، مختلف



خدمات کے صلہ میں ہزاروپانصدی ذات ہشت صد سوار کا منصب پایا۔

راجہ دیبی سنگھ بندیلہ: شاہ جہانی دربار میں مختلف قسم کی جنگی اور ملکی خدمات کے صلہ میں دو ہزاروپانصدی دو ہزار سوار کا منصب پایا لیکن مہاراجہ جسونت سنگھ سے اختلاف ہوا تو قید میں ڈال دیا گیا، قید سے رہائی کے بعد عالمگیر سے جا ملا، عالمگیر نے اس کو بہلسہ کا فوجدار مقرر کیا اور پھر یوسف زئی پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا، ۱۳ جلوس میں محمد امین خاں صوبہ دار کابل کے ساتھ تعینات ہوا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۲۵۷ تا اثر الامراء ج ۲ ص ۲۹۵)

راؤ دودھ سیسودیہ: ۳ جلوس شاہ جہانی میں دو ہزاری ذات ہزاروپانصد سوار کا منصب پایا، ۶ جلوس میں شاہ جہاں کی خاطر دولت آباد کے قلعہ کے محاصرہ میں بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔

راجہ دوار کا داس کچھواہہ: ہزاروپانصدی ذات ہزار سوار کا منصب دار تھا، خاں جہاں لودی کے خلاف بڑی جاں بازی سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

راوت دیال داس جھالا: دھرمات کی جنگ میں داراشکوہ کی حمایت میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

رام داس نروری: دو ہزار ہزار سوار کا منصب دار رہا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۲۸۷)

رائے سنگھ: راجہ گج سنگھ راٹھور کا پوتا تھا، ہزاری ہفت صد سوار کا منصب دار ہوا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۳۷)

رائے سنگھ جھالا: داراشکوہ کے ساتھ قندھار کی مہم میں ساتھ رہا، ہزاری ذات ہفت صد

سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۳۷)

راورپ سنگھ چندراوت: پرگنہ رام پور کا جاگیر دار تھا، قندھار کی مہم میں شریک رہا ہزار

وپانصدی ہزار سوار کا منصب پایا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۰۷)

رتن سنگھ راٹھور: اورنگ زیب کی شاہزادگی کے زمانہ میں بلخ کی مہم میں ساتھ رہا لیکن

دھرمات کی جنگ میں داراشکوہ کی حمایت میں لڑتا ہوا مارا گیا، ہزاروپانصدی ہزاروپانصد

سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۹)

راجہ رام روپ: ۱۹ جلوس شاہ جہانی میں ہزار روپا نقدی ذات ہزار سوار کا منصب اور راجہ کا خطاب پایا، پرگنہ جموں کی خاندانی حکومت مرحمت ہوئی، مختلف لڑائیوں میں شریک رہ کر اپنی بہادری دکھائی اور آخر میں دو ہزاری روپا نقد سوار کا منصب پایا، سموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب سے جاملا اور اورنگ زیب کی حمایت میں اجمیر کی جنگ میں لڑا، ۳۰ جلوس عالمگیری میں غزنی میں تعینات ہوا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۶ و آثار الامراء ج ۲ ص ۷۷۷)

راجہ امر سنگھ زوری: راجہ رام داس زوری کا پوتا تھا، زور کا قلعہ دار رہا پھر بلخ، بدخشاں، قندھار اور بست کی مہم میں شریک ہوا، ۳۰ جلوس میں ہزار روپا نقدی ذات ہزار سوار کے منصب سے نوازا گیا۔ (آثار الامراء ج ۲ ص ۷۷۷)

راجہ بند سنگھ بہدوریہ: ہزاری ہزار سوار کا منصب دار ہوا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۲)

بہار ایل: ہزاری صد و پنجاہ کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۷)

راؤ امر سنگھ چندراوت: راؤ چاندو کا پوتا تھا، پرگنہ رام پوراس کی جاگیر میں تھا شہزادہ اورنگ زیب اور داراشکوہ کے ساتھ قندھار کی مہم میں شریک رہا، ہزاری ہزار سوار کا منصب دار تھا، صوبہ دکن اور مالوہ میں بھی متعین رہا، عالمگیری کے زمانہ میں اس کے گیارہویں سال جلوس میں قلعہ سالسر کی لڑائی میں مارا گیا۔

بکرماجیت جگ راج بندیلہ: راجہ چہار سنگھ بندیلہ کا بیٹا تھا، خاں جہاں لودی کے تعاقب میں بڑی بہادری دکھائی اس لیے منصب دو ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب پایا، قلعہ دولت آباد اور پریندہ کے محاصرہ میں بھی شریک رہا۔ (آثار الامراء ج ۱ ص ۵۲۶)

بلجدر شخاوت: کچھواہہ راجپوتوں کی گوت شخاوت سے تھا، شاہ جہاں نے چہار سنگھ بندیلہ کی تشبیہ کے لیے جو فوج بھیجی اس میں یہ بھی شریک تھا، نظام شاہ کے خلاف جو مہم گئی اس کے ساتھ بھی رہا پھر خاں جہاں لودی کی مہم میں جانبازی سے لڑتا ہوا میدان جنگ میں مارا گیا،

منصب ہزاری ذات شش صد سوار پر فائز تھا۔

بہاری داس کچھواہہ: ترقی پا کر کابل میں متعین ہوا اور دو ہزاری ذات ہزار دو صد سوار کا منصب پایا۔

راجہ بھیم راٹھور: ہزار و پانصدی ذات ہزار سوار کا منصب دار تھا، مختلف معرکوں کے علاوہ ساہو جی بھونسلہ کے خلاف مہم میں بھی شریک رہا۔ (بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۷۳۰)

رائے بہاری مل دیوان: مختلف اوقات میں لاہور، ملتان، خالصہ شاہی اور کل پنجاب کا دیوان رہا، آخر میں داراشکوہ کی سرکار کا دیوان ہوا۔

پر تھی راج راٹھور: خاں جہاں لودی کی مہم ناسک اور دولت آباد کی لشکر کشی میں مفید خدمات انجام دے کر ۱۹ جلوس اکبر آباد کا قلعہ دار مقرر ہوا، بلخ، بدخشاں اور کابل پہنچ کر بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دیا دو ہزاری ذات، دو ہزار سوار کا منصب دار تھا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۶)

راجہ پر تھی چند: چنبہ کے راجا کا بیٹا تھا، منصب ہزاری چہار صد ہزار سے سرفراز تھا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۶)

رائے تلوک چند کچھواہہ: ۹ میں ساہو جی بھونسلہ کے خلاف بھیجا گیا، ہزاری ذات و پانصد سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۵)

برسو جی بھونسلہ: سہ ہزاری و ہزار و پانصد سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۳)

راول پونجا: دو نگر پور کا زمیندار تھا، دربار سے ہزار و پانصدی ہزار و پان صد سوار کا منصب پایا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۹)

پر تاب چردہ: ہزاری ہزار سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۳)

راجہ ٹوڈرل شاہ جہانی: شاہ جہاں کے وزیر اعظم افضل خاں کی سرکار میں ملازم تھا پھر ترقی پائی تو سرکار دیپال پور پر گنہ جالندھر اور سلطان پور کی دیوانی مرحمت ہوئی اور منصب دو ہزار

پانصدی ہزاروپانصدسوار، دواسپہ، سہ اسپہ سے سرفراز کیا گیا، عالمگیر کے عہد میں اثاوت کا فوجدار تھا۔ (مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۸۶)

جادوں رائے دکنی: سہ ہزاری، ہزاروپانصدسوار کا منصب دار تھا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۲۳)

راجہ جے رام بڑگوجر: راجہ انوپ سنگھ کا بڑا بیٹا تھا، ۱۴ جلوس میں صوبہ کابل میں متعین ہوا بلخ اور بدخشاں کی مہم میں بھی ساتھ رہا، دو ہزاری ذات و پانصدسوار کا منصب دار تھا۔

(مآثر الامراء، ج ۲ ص ۲۴۱)

راج سنگھ: کیفواں راٹھور کا بیٹا تھا، ہزاری شش صدسوار کا منصب دار ہوا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۳)

کنور رام سنگھ: جے سنگھ کچھواہہ کا بیٹا تھا، ہزاری ہزارسوار کا منصب پایا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۲)

راج سنگھ راٹھوریرہا دن: منصب ہزاری ذات، چہار ذات، چہار صدسوار پر فائز تھا۔

رام سنگھ راٹھور: قندھار، بلخ اور بدخشاں میں اپنی کارگزاری دکھائی، ترقی کر کے دو ہزاری

دو ہزارسوار کا منصب پایا اور داراشکوہ کی حمایت میں بڑی جانبازی سے لڑتا ہوا سموگڑھ کی

لڑائی میں مارا گیا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۲۷۷)

راؤ پتی سنگھ چندراوت: ہزاروپانصدی ہزار کا منصب دار رہا۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۰)

رائے با: جادوں رائے دکنی کا بھائی تھا، ہزاروپانصد شش صدسوار کا منصب پایا۔

(بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۳۱)

راوت رائے دکنی: ۲۰ جلوس میں سہ ہزاری ہزاروپانصدسوار کا منصب دار ہوا۔

راجہ سیورام گوڑ: ۱۰ جلوس میں اسیر کا ۲۰ جلوس میں کابل کا اور ۳ جلوس میں ماٹوکا

قلعہ دار مقرر ہوا، دو ہزاری ذات ہزاروپانصد کے منصب پر فائز تھا، سموگڑھ کی لڑائی میں

داراشکوہ کی خاطر لڑائی میں مارا گیا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۲۶۳)

سبحان سنگھ سیسودیہ: رانا امر سنگھ کا پوتا تھا، ۲۵ رجلوس میں ترقی پا کر دو ہزاری ذات، ہشت صد سوار کا منصب پایا اور داراشکوہ پر دھرمادت کی جنگ میں رام رام کہتا اور حق نمک ادا کرتا ہوا فدا ہو گیا۔ (ماثر الامراء، ج ۲ ص ۲۵۲)

سبل سنگھ سیسودیہ: رانا امر سنگھ کا پوتا اور دو ہزاری ذات ہزار سوار کا منصب دار تھا۔

(ماثر الامراء، ج ۲ ص ۲۶۸)

سیام سنگھ: کرم سی راٹھور کا بیٹا تھا، ہزار و پانصدی شش صد سوار کا منصب دار ہوا۔

(بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۳۱)

راول سرسی: بانسوالہ کا زمیندار تھا، ہزاری ہزار سوار کا منصب دار ہوا۔

(بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۳۲)

راؤ کرن بہورتیہ: دو ہزاری و پانصد سوار کا منصب دار تھا۔

کشن سنگھ بھدورویہ: ہزاری شش صد سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۳۵)

گردھراس گوڑ: ۹ رجلوس میں جھانسی کا اور ۲۹ میں اکبر آباد کا قلعہ دار مقرر ہوا، ہزاری

ہشت سوار سے دو ہزاری ذات دو ہزار سوار کا منصب دار ہوا۔ (بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۳۳)

اندر سال ہاڈا: راؤرتن ہاڈا کا پوتا تھا، مختلف خدمات انجام دے کر شہزادہ مراد بخش کے

ساتھ کابل میں متعین ہوا، بلخ اور بدخشاں کی مہم میں بھی اپنی سپہ گری کا جوہر دکھایا، ہشت

صدی جہاں صد سوار کا منصب دار تھا۔ (بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۴۰)

ہفت صدی کے منصب دار: راجہ بہروز ولد راجہ روزا فزوں، بھوج راجہ کچھواہہ، چندر

بھان نروکا، راوت دیال داس جھالا، چتر بھوج چوہان، جگناتھ راٹھور، سنگرام کچھواہہ، متھرا

داس کچھواہہ، راجہ اودے بھان، نرائن داس سیسودیہ، رائے سبھا چند۔

(بادشاہ نامہ، ج ۲ ص ۷۴۱-۷۴۲)

شش صدی کے منصب دار: پرتاپ سنگھ چوہان، اگرسین ولد ستر سال کچھواہہ، بھیم چندر، راجہ امر سنگھ زوری۔

پانصدی کے منصب دار: پرتاپ سنگھ چوہان، ہمیر سنگھ سیسودیہ، بلوچوہان، گوبند داس راٹھور، جسونت سنگھ برادر مہیش داس راٹھور، پرتھی سنگھ، سکت سنگھ، بنی داس ولد راجہ برسنگ دیوبندیہ، اگرسین (راجہ مان سنگھ کا پوتا) کیسری سنگھ۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۴۶-۴۵۲)

شاہ جہاں کی رواداری حکمت علمی: شاہ جہاں کی مذہبی رواداری کا یہ بھی ثبوت ہے کہ اس نے اپنے راجپوت اور ہندو فوجی سرداروں پر وہی اعتماد کلی رکھا جو اس کو اپنے مسلمان فوجی منصب داروں پر تھا بلکہ بدخشا اور ایران میں جو فوجیں بھیجی گئیں ان میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ راجپوت سردار مثلاً راجہ جسونت سنگھ، راجہ دیبی سنگھ، راؤ روپ سنگھ، چندر راوت، راجہ رائے سنگھ سیسودیہ، راجہ روپ سنگھ راٹھور، رتن سنگھ، رام سنگھ راٹھور، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راجہ پہاڑ سنگھ، ٹھل داس اور راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ تھے وہ اپنے مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ اس مہم میں دوش بدوش رہ کر شریک ہوتے اور کسی لمحہ میں یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ اس شاہی فوج کے اجزائے لاینفک نہیں ہیں، چھوٹی بڑی لڑائیوں میں راجپوت سرداروں کی نگرانی میں مسلمان لشکری بلا تکلف رکھ دیے جاتے اور راجپوت لشکری مسلمان فوجی سرداروں کا ماتحت ہو کر اپنی معرکہ آرائی کا ثبوت دیتے، وہ ہندو راجاؤں کے خلاف فوجی مہم میں اسی طرح شریک تھے جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف کسی مہم میں شریک ہوتے، یہ مغل بادشاہوں کے عمل تسخیر کا نتیجہ تھا۔

شاہ جہاں پر الزامات: شاہ جہاں پر یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندروں کا انہدام کیا، عبدالحمید لاہوری نے بھی بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ شاہ جہاں اپنے ساتویں سنہ جلوس میں شاہی لشکر کے ساتھ گجرات (پنجاب) پہنچا تو وہاں اس سے شکایت کی گئی کہ وہاں کے کچھ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے یہاں ڈال رکھا ہے اور کچھ مسجدوں کو شہید کر

کے ان کی جگہ پر مندر بنا لیے ہیں، شاہ جہاں نے شاہی فرمان جاری کر کے مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے یا تو نکال لیا یا یہ کہا کہ ان کا نکاح پھر سے باضابطہ طور پر اسلامی طرز سے ہو اور پھر ان مندروں کی جگہوں پر مسجدیں تعمیر کرائیں جہاں مسجدوں کو شہید کر کے مندر بنائے گئے تھے۔ (بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ دوم ص ۵۷)

اس نے اپنے چھٹے سنہ جلوس میں بنارس کے ایک مندر کو بھی منہدم کیا، مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں مندروں کے انہدام کے کچھ واقعات پیش آتے رہے، اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندروں کے انہدام کی وجہ سے بغاوتیں ہوتی رہیں یا بغاوتیں ہوئیں تو مندر منہدم کیے گئے اگر معروضی مطالعہ کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ بغاوتوں کے موقع پر کہیں کہیں کے مندر منہدم ہوتے رہے کیوں کہ اگر ان حکمرانوں کا مسلک مندروں کو منہدم کرنا ہوتا تو آگرہ اور دہلی کے پاس خصوصاً متھرا میں کوئی بھی مندر اس وقت نظر نہیں آتا وہاں اب بھی ایسے مندر موجود ہیں جو مغلوں کے دور سے بہت پہلے بنائے گئے تھے، موجودہ دور میں مندروں کے انہدام کو ایک سیاسی مسئلہ اس لیے بنا دیا گیا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے جذباتی طور پر ہندو مسلمان میں اختلاف پیدا کیا جائے۔

اگر شاہ جہاں نے مندر منہدم کیے تو مجموعی حیثیت سے ہندوؤں میں اس کے خلاف کوئی نفرت نہیں پھیلی، ہندو اور راجپوت دونوں اس کے دربار سے منصب اور عہدے پا کر اس کے وفادار بنے رہے جیسا کہ گذشتہ فہرست سے اندازہ ہوگا، اس عہد کے سنسکرت زبان کے شعرا بھی اس کے اوصاف میں نغمے لاپتے رہے، اس زمانہ کا ایک سنسکرت شاعر جگناتھ پنڈت راج اس کی شان میں کہتا ہے:

”اے بادشاہ شہاب الدین (شاہ جہاں)! یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص دنیا

میں موجودہ زمانہ میں نہ گذشتہ میں آپ کی لیاقت کے برابر ہو اس کے لیے کسی

ثبوت کی ضرورت نہیں اگر خالق دنیا پھر سے نئی چیزوں کو پیدا کرے تو بھی کوئی

کسی لحاظ سے آپ کی برابری نہیں کر سکے گا۔“

شاہ جہاں کا ایک درباری شاعر ہری نرائن مصرابھی اس کی مدح میں کہتا ہے:

”ایک بڑے اور بھاری بادل نے ایک بلند پہاڑ کی اونچی پر برسنا شروع کیا

تو اے بادشاہ! سرسوتی کا دریا فتح مند پر شور پاک و صاف ہو گیا، اے شاہ جہاں!

میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس دریا کی پاکی کی وجہ سے اس میں جو شخص نہاتا ہے،

اس کا سر کنول کی طرح چمکیلا اور روشن ہو جاتا ہے اس کے بال شہد کی مکھی کی

طرح ہو جاتے ہیں۔“

بادل سے مراد شاعر ہے اور بلند پہاڑ کی اونچی چوٹی خود بادشاہ کی ذات ہے

مطلب یہ کہ جو کوئی بادشاہ کی تعریف میں شاعری کی شاعری سنتا ہے اس کا چہرہ کنول کی طرح

شگفتہ ہو جاتا ہے۔ (سنسکرت مسلمانوں کی سرپرستی میں، از کنڈے راؤ ہرکارے، اسلامک

کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ہندوستان کے مشہور مؤرخ کے۔ ایم پنکر نے لکھا ہے کہ شاہ جہاں ایک پر جوش

مسلمان تھا اس پر یہ دھبہ ہے کہ اس نے کچھ مندروں، خصوصاً بر سنگھ بندیلہ کے مندر کو منہدم

کیا لیکن اس نے کبھی ہندوؤں کو اپنے سے دور نہیں کیا، راجپوتوں کے ساتھ تو سیاسی اتحاد

میں پختگی دکھائی، اس کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں ہندو افسروں کی تعداد اکبر کے

عہدے سے زیادہ تھی، راجہ رگھناتھ اس کے مال کا نائب وزیر تھا وہ کھتری تھا مگر ترقی کرتا چلا

گیا، شاہ جہاں نے اپنے لڑکے اورنگ زیب کو دکن خط لکھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مخالفانہ

رویہ اختیار نہ کرے، شہاہ جہاں نے اپنی ریاست کے قومی کردار کو پورے طور پر برقرار رکھا

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اورنگ زیب نے باغیانہ روش اختیار کی تو شاہی

فوج جو دھ پور کے جسونت سنگھ راٹھور کی نگرانی میں بھیجی گئی۔

(اے سروے آف انڈیا ص ۱۶۱، ۱۹۶۳ء ایڈیشن)



سنسکرت اور ہندی کی سرپرستی: شاہ جہاں نے سنسکرت اور ہندی زبان کی جو سرپرستی کی وہ بھی اس کی مذہبی رواداری کا ثبوت ہے اس کا محبوب شاعر جگناتھ پنڈت راج تھا جو اس کی شان میں برابر قصیدے کہتا رہا، شاہ جہاں نے اس کو کوی رائے کا خطاب دیا تھا اس کا حریف ہنسی دھر مصر تھا جو ممتاز محل کی تعریف میں اشعار کہتا تھا، ایک دوسرا سنسکرت شاعر ہری نرائن مصر بھی مدتوں دربار کی زینت بنا رہا، سنسکرت کے ایک اہل قلم منیشور نے علم نجوم پر سنسکرت میں ایک کتاب لکھ کر شاہ جہاں کے نام سے معنون کی تھی، اسی طرح بھگوتی سوامن نے سنسکرت عروض سے متعلق کتاب لکھی تو یہ بھی شاہ جہاں کے نام سے معنون ہوئی، ویدنگ راجہ نے بھی اپنی کتاب شاہ جہاں ہی کے نام سے معنون کی تھی۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو، سنسکرت مسلمانوں کی سرپرستی میں، از گنڈے راوہر کارے، اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ہندی میں شاہ جہانی دربار کا کوی رائے یا مہاکوی یعنی ملک الشعرا سندرتھا جو سندرتھ نگار کا مصنف تھا، ہندی کے مشہور شعرا چنٹامنی اور راجہ شنبھوناتھ بھی اس کے دربار سے منسلک رہے، ایک شاعر سرسوتی نے شاہ جہاں کی فرمائش پر نداکل لٹا لکھی، اس میں شاہ جہاں داراشکوہ اور جہاں آرا کی مدح میں نظمیں ہیں۔ (ہٹسری آف ہندی لٹریچر از ایف۔ ای کی ص ۳۸-۳۶) شاہ جہاں جب کسی شاعر کی کویتا سے خوش ہوتا تو ہزار ہزار اور دو ہزار روپے اور ہاتھی انعام میں مرحمت کرتا۔ (بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ج ۱ ص ۲۶۹، منتخب اللباب از خانی خان ج ۱ ص ۷۰۷-۷۰۶) ایک اور ہندی شاعر سرومنی نے شاہ جہاں ہی کی فرمائش پر اروتی نام کا ایک منظوم لغت تیار کیا۔ (پنجاب میں اردو، از محمود شیرانی ص ۱۱)

ہندی راگنیوں سے دل چسپی: شاہ جہاں کو ہندی راگنیوں سے بھی دلچسپی رہی جن میں سے وہ راگ دھرپد کا عاشق تھا اسی لیے اس کے حکم سے دھرپد کے مشہور ماہر بخشونا ایک ایک ہزار منتخب دھرپد جمع کر کے ایک کتاب میں قلم بند کیے گئے اور اس کا نام ہزار دھرپد

نایک بخشور کھا گیا۔ (فہرست مخطوطات فارسی، بوڈلین لائبریری ۱۸۶۴)

ہندوؤں کے علوم سے مسلمانوں کی دلچسپی: شاہی دربار سے باہر اسی دور میں مولانا عبدالرحمان چشتی نے مہادیو اور پاروتی کی گفتگو قلم بند کر کے ہندوؤں کے نظریہ تحقیق کو سمجھایا (خطبہ صدارت مغل، ہسٹری سیکشن، ازڈاکٹر تارا چند، انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۳۹ء) پھر مرآة المخلوقات میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوؤں کی بعض مذہبی ہستیاں مسلمانوں کے تخیل کے مطابق ہیں، مثلاً مہادیو کو شاہ جن کہا جاسکتا ہے، اسی طرح انھوں نے بعض دوسری شخصیتوں کو حضرت آدم اور رسول اللہ ﷺ سے مطابقت دی ہے، انھوں نے بھگوت گیتا کا بھی منظوم ترجمہ فارسی میں کیا۔ (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم جلد ۳ ص ۱۰۳۴)

اسی دور میں شمس بازغہ کے مشہور مصنف ملا محمود جون پوری نے ہندوستان کے خاص فن نایکا بھید کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر ایک کتاب لکھی، مولانا نجم الدین حسن کے رسالہ شطاریہ میں ہندوؤں کے مراقبے (سادھی) کے طریقے لکھے ہیں، ریاجین البساتین میں نروہان (نجات) کی بحث کی ہے، (خطبہ صدارت ڈاکٹر تارا چند) موبد کی دبستان المذاہب میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں سے متعلق بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہے۔

ہندوؤں کے مذہبی علوم سے داراشکوہ کی دلچسپی: شاہ جہاں کی مذہبی رواداری اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس نے داراشکوہ کو اپنا ولی عہد بنایا اور دوسرے تمام شہزادوں کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دے کر آخر آخروقت تک اس کا حامی بنا رہا، داراشکوہ نے اپنی شہزادگی ہی کے زمانہ سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اگر منتخب نشین ہوا تو وہ دوسرا اکبر ہوگا، اکبر نے ایک ملا جلا مذہب تیار کیا تھا جو چل نہ سکا وہ چوں کہ امی تھا اس لیے اس نے اپنے اس مذہب کو اپنی حکومت کے زور سے ترویج دینے کی کوشش کی مگر داراشکوہ کا علمی اور مذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا اس لیے اپنے قلم کے زور سے ایک ایسا مذہبی ذہن بنانے کی کوشش کی جس میں اسلام اور ہندومت دونوں کا رنگ ہو، پہلے تو اس نے اپنی

تصنیف حسنات العارفین میں شریعت و طریقت، کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود کی تفریق مٹانے کی کوشش کی پھر اس نے اپنی عمر کے بیالیسویں سال میں مجمع البحرین لکھی اس میں اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتایا اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تصوف اور فلسفہ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں یہ خیال کہاں تک صحیح تھا یا اس کے عقائد اسلامی عقائد کے مطابق تھے یا نہیں اس سے بحث نہیں، اس نے ہندو مسلمان دونوں کو قریب تر کرنے کی کوشش میں یہ کتاب لکھی اس کے اقتباسات یہاں پر اس لیے درج کیے جا رہے ہیں تاکہ اس کی کوشش کی ایک جھلک سامنے آجائے ان کو رد یا قبول کرنے کا سوال نہیں ہے۔

عناصر: ناسوتی مخلوقات کے لیے پانچ عناصر تسلیم کیے گئے ہیں جو اہل شرع کے نزدیک یہ ہیں:

۱۔ عنصر اعظم، جس کو عرش اکبر بھی کہتے ہیں ۲۔ باد ۳۔ آتش ۴۔ خاک ۵۔ آب۔

اہل ہند پانچ عناصر کو پانچ بھوت کہتے ہیں جو ان کے نزدیک یہ ہیں:

۱۔ اکاس ۲۔ بائی ۳۔ تیج ۴۔ جل ۵۔ پرتھی۔

اکاس کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ بھوت آکاس ۲۔ من اکاس ۳۔ چد آکاس۔

جو تمام عناصر کو گھیرے ہوئے ہے وہ بھوت آکاس ہے جو موجودات کو گھیرے

ہوئے وہ من آکاس ہے اور جو سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے وہ چد آکاس ہے، چد آکاس

سے عشق کا ظہور ہوتا ہے جس کو اہل ہند مایا کہتے ہیں اور عشق سے روح اعظم نکلتی ہے جو جیو

آتما ہے، روح اعظم ہی حقیقت محمدی ہے ہندوستان کے موحد اس اعظمت کو ہرن گر بھ اور

اوستھات آتما کہتے ہیں۔

اہل شرع کے نزدیک جو باد، آتش، آب اور خاک ہے وہ ہندوستان کے موحدوں

کے نزدیک بائی، تیج، جل، اور پرتھی ہے، قیامت کو ہندوستانی موحد مہا پرلی کہتے ہیں اور

جس طرح یہ عقیدہ ہے کہ قیامت میں خدا کے سوا سب فنا ہو جائیں گے اسی طرح ہندوستانی

موحد کہتے ہیں کہ مہا آکاس کے سوا ہر چیز فانی ہے، خاک کو اہل ہندویہ کہتے ہیں کہ جس سے ساری چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور جہاں ہر چیز واپس جائے گی یہی چیز قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے مٹی سے پیدا کیا، مٹی میں تم کو لے جائیں گے اور مٹی سے پھر باہر کریں گے۔

حواس: پانچ عناصر کی طرح پانچ حواس ہیں جن کو اہل ہند پنج اندری کہتے ہیں، پانچ حواس شاملہ، ذائقہ، باصرہ، سامعہ اور لامسہ ہیں جن کو اہل ہند کہران، رسنا، چھ، سروتر اور توک کہتے ہیں، حواس باطن بھی پانچ ہیں: ۱۔ حس مشترک ۲۔ متخیلہ ۳۔ متفکرہ ۴۔ حافظہ ۵۔ واہمہ اہل ہند کے نزدیک حواس باطن چار ہیں: ۱۔ بدھ ۲۔ من ۳۔ آہنکار ۴۔ چت، ان چاروں حواس کو انتہ کرنا کہتے ہیں جو مذکورہ بالا پانچوں حواس کے برابر ہیں۔

شغلی: ہندی موحدوں کے نزدیک بہترین شغلی اجپا ہے جو نیند اور بیداری کی حالت میں بے قصد اور بے اختیار جاری رہتا ہے اس شغلی میں جو سانس باہر نکلتی ہے اس کو ”او“ کہتے ہیں اور جو اندر جاتی ہے اس کو ”من“ کہتے ہیں، صوفیہ کے یہاں یہی چیز ”ہواللہ“ سے ظاہر ہوتی ہے جو سانس اندر جاتی ہے وہ ”ہو“ ہے اور جو باہر آتی ہے وہ ”اللہ“ ہے اور ہر ذی حیات میں یہ چیز پائی جاتی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہے۔

صفات اللہ تعالیٰ: صوفیہ کے یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفت جمال اور جلال ہیں اور تمام آفرینش ان ہی دو صفت کے ماتحت ہیں ہندوستان کے فقراء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے یہ تین صفت ہیں جن کو وہ ترگن کہتے ہیں: ۱۔ ست ۲۔ رج ۳۔ تم ست یعنی ایجاد، رج یعنی ابقا اور تم یعنی فنا ہے، صوفیہ کے یہاں رج یعنی ابقا جمال کی صفت ہی میں شامل ہے یہ تینوں صفتیں برہما، بشن اور ہمیش سے منسوب ہیں جو صوفیہ کی زبان جبریل، میکائیل اور اسرافیل کہلاتے ہیں، برہما یعنی جبریل ایجاد، بشن یعنی میکائیل، ابقا اور ہمیش یعنی اسرافیل فنا کے موکل ہیں۔

روح: روح کی دو قسمیں ہیں: روح اور ابوالا روح جن کو ہندی فقرا آتما اور پریم آتما

کہتے ہیں۔

عوالم اربعہ: صوفیہ کے یہاں چار عالم ہیں: ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، ہندی فقرا کے یہاں ان چاروں عالم کو جاگرت، سپن، سکھوپت اور تریا کہتے ہیں۔

آواز: جو ”کن“ کا مفہوم ہے وہ ہندی فقرا کے یہاں لفظ سرتی سے ظاہر ہوتا ہے جو آواز مطلق کے معنی ہیں وہی ”اناہت“ کے ہیں، اسم اعظم کو ہندی فقرا پیدا مکھ کہتے ہیں اور جو فتحہ، ضمہ اور کسرہ سے ظاہر ہوتا ہے وہی اکار و کار اور مکار سے ہوتا ہے۔

نور: نور کی تین قسمیں ہیں اگر یہ جلال کی صفت میں ظاہر ہوتا ہے تو آفتاب یا یاقوت یا آگ کارنگ اختیار کرتا ہے اور جمال کی صفت میں ظاہر ہوتا ہے تو ماہتاب یا چاندی یا مروارید یا پانی کارنگ اختیار کرتا ہے لیکن تیسرا نور نور ذات ہے جو ان تمام رنگوں سے منزہ ہے یہ نور اولیا اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں دکھائی دیتا، ہندوستان کے فقرا اس نور کو جون سروپ، سوپر کاس اور سپن پر کاس سے تعبیر کرتے ہیں۔

رویت: رویت الہی کو ہند کے موحد ساچھات کار کہتے ہیں۔

اسمائے الہی وغیرہ: ذات مطلق کو آسن، بخت کو ترگن، غیب الغیب کو نرنکار، واجب الوجود کو نرنجن، علم کو چتن، الحق کو اشت، قادر کو سمرتھ، سمیع کو سروتا، بصیر کو درشنا، اللہ کو اوم، ہو کو سہ، فرشتہ کو دیوتا، مظہر کو اوتار، وحی کو آکاس وانی، حور کو انچھر، شیطان کو راجھس، ولی کو رشی اور نبی کو مہاسدھ کہتے ہیں۔

برہماند: ”کل“ کے جو معنی ہیں اس کے لیے ہندوستان کے موحدوں کے یہاں برہما کا لفظ ہے۔

جہات: اسلام میں مشرق، مغرب، شمال، جنوب، فوق، تحت، چھ جہات لیکن ہندوستان کے موحدوں کے نزدیک چھ جہت کے علاوہ چار جہت مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کے مابین کے حصے بھی ہیں۔

آسمان: آسمان کو ہندی موحد گنگن کہتے ہیں آسمان میں سات سیارے ہیں زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر اہل ہند پچھتر برسپت، منگل، سورج، سکر، بدھ اور چندراما کے نام سے پکارتے ہیں، آٹھویں آسمان کو اہل شرع فلک ثوابت یا کرسی کہتے ہیں ان کے یہاں نواں آسمان نہیں لیکن اہل ہند کے یہاں نواں آسمان بھی ہے جس کو وہ مہا اکاس کہتے ہیں۔

زمین: اہل ہند کے نزدیک زمین کے ساتھ طبقات ہیں جس کو وہ سپت تال کہتے ہیں اور وہ یہ ہیں ۱۔ اتل ۲۔ بتل ۳۔ سوتل ۴۔ تلاتل ۵۔ مہاتل ۶۔ رساتل ۷۔ پاتال، اہل اسلام کے نزدیک بھی زمین سات ہیں جیسا کہ کلام پاک میں ہے: اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلہن۔

قسمت زمین: حکمانے اس دنیا کو سات طبقات میں تقسیم کیا ہے جن کا نام ہفت اقلیم رکھا ہے اہل ہند اس کو سپت دیپ کہتے ہیں، سات پہاڑ کو اہل ہند سپت کلا چل کہتے ہیں جن کے نام یہ ہیں: ۱۔ سمیرد ۲۔ سمویت ۳۔ ہمکوت ۴۔ ہمون ۵۔ مکدہ ۶۔ پار جاترے ۷۔ کیلا ۸۔ قرآن شریف میں بھی والجبال اوتادا کا اشارہ ہے، اہل ہند کے نزدیک ان پہاڑوں کے اردگرد سات سمندر (سپت سمدر) ہیں جن کے نام یہ ہیں: ۱۔ لون سمدر (کھاڑی پانی کا سمندر) ۲۔ رس سمدر (لشکر کا سمندر) ۳۔ سراسمدر (شراب کا سمندر) ۴۔ گھرت سمدر (گھی کا سمندر) ۵۔ دوہ سمدر (دہی کا سمندر) ۶۔ کھیر سمدر (دودھ کا سمندر) ۷۔ سواد جل (ننھرے پانی کا سمندر) قرآن کریم میں اس آیت کریمہ سے سات سمندروں کی طرف اشارہ ہے: ولو ان مافی الارض من شجرة اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعة ابحر ما نفدت کلمات اللہ، محققان ہند کے نزدیک جو پہاڑ، دریا اور سرزمین، زمین، پہاڑ اور دریا کے اوپر ہیں ان کو وہ سرگ کہتے ہیں جو بہشت اور جنت ہے اور جو زمین اور دریا زمینوں، پہاڑوں اور دریا کے نیچے ہیں وہ نرک ہے جس سے مراد دوزخ اور جہنم ہے، بہشت کی چھت کو وہ من آکاس کہتے ہیں جو عرش ہے۔

عالم برزخ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: من مات فقد قامت قیامتہ، یعنی جو شخص کہ مراپس تحقیق کہ اس کے لیے قیامت ہے، اہل ہند کے نزدیک موت کے بعد آتما یعنی روح بدن عنصری سے نکل کر بدن مکت میں داخل ہو جاتی ہے جس کو سوچہم سریر کہتے ہیں اور یہ وہ لطیف بدن ہے کہ اس نیک عمل سے نیک صورت اور برے عمل سے بری صورت بنتی ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ سوال و جواب کے بعد اہل بہشت بہشت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جاتے ہیں۔

قیامت: جس کو اہل اسلام قیامت کبریٰ کہتے ہیں اس کو ہندوستان کے موحد مہا پرلی کہتے ہیں۔

مکت: مکت کے یہ معنی ہیں کہ ہلاک اور محو ہو کر ذات باری میں مل جانا یہی بات اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے: رضوان من اللہ اکبر ذالک هو الفوز العظیم۔ رضوان اکبر یعنی فردوس اعلیٰ میں داخل ہونا بہت بڑی رستگاری ہے جس کو مکت کہتے ہیں، مکت کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ جیون مکت، اس سے مراد ہے کہ زندگی ہی میں رستگاری حاصل ہو یہ اس طرح ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے عرفان اور شناسائی کی بدولت دنیا کی ہر چیز کو ایک جانے اور تمام اعمال، افعال، حرکات اور سکناات کو چاہے وہ اچھے یا برے ہوں، حق تعالیٰ ہی کا سمجھنے اور اپنے اور تمام اشیائے موجودہ کو عین حق جانے اور ہر چیز میں حق تعالیٰ ہی کو جلوہ گرد دیکھے۔ مکت کی دوسری قسم سرب مکت ہے جس میں ہر قسم کی قید سے رستگاری ہو جاتی ہے یعنی قیامت کبریٰ، آسمان، زمین، بہشت، دوزخ، برہماند، دن اور رات کے فنا ہو جانے کے بعد ذات الہی میں گم ہو کر یہ مکت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کریم کی یہ آیتیں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں، و رضوان من اللہ اکبر، ذالک هو الفوز العظیم، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

مکت کی تیسری قسم سربدا مکت ہے جس میں عارف اپنے کو دن کا وقت ہو یا رات

ہو، عالم باطن ہو یا عالم ظاہر ہو، برہمانند کو دیکھتا ہو خواہ ماضی یا حال یا مستقبل میں ہو بالکل آزاد پاتا ہے اور قرآن میں جو خالدین فیہا ابد کہا گیا، اس میں بہشت سے مراد جنت معرفت ہے اور ابد اسے مراد اس مکت کی ابدیت ہے، عارخوں کی مزدوری فردوس اعلیٰ ہی ہے۔

مجمع البحرین لکھنے کے بعد داراشکوہ نے ہندو مذہب کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے یا کرائے، اس نے ۱۰۶۷ ہجری میں اوپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا اس میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر دی اور دیباچہ میں لکھتا ہے:

”۱۰۶۷ ہجری میں بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا اور توحید کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتیں جن کا میں طلب گار تھا لیکن حل نہیں پاتا تھا، اس قدیم کتاب کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں جو بلاشک و شبہ پہلی آسمانی کتاب ہے اور بحر توحید کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے اور صراحتہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بیعہ اس کتاب آسمانی، سرچشمہ بحر توحید اور قدیم کے حق میں ہے، انہ لقران کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون، تنزیل من رب الغلمین۔“

یعنی قرآن کریم ایسی کتاب میں ہے جو پوشیدہ ہے اور اس کو نہیں چھوتے ہیں مگر وہ جو کہ پاک ہیں وہ نازل ہوتی ہے خداوند عالم کی طرف سے متعین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت تورات اور انجیل کے حق میں نہیں ہے، لفظ تنزیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے حق میں ہے چونکہ انکھپت جو کہ ایک مخفی راز ہے اصل و ماخذ ہے اور قرآن مجید کی آیتیں بیعہ اس میں پائی جاتی ہیں، پس تحقیق کہ چھپی ہوئی کتاب یہی کتاب قدیم ہے اس فقیر کا جس نے بے جانی ہوئی چیزوں کو جان لیا اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا اس ترجمہ کے کرنے میں



اس کے سوا کوئی اور مطلب اور مقصد نہ تھا کہ وہ اس کی اولاد، اس کے دوست اور حق کے طلب گار فائدہ اٹھائیں۔

بھگوت گیتا کا ایک فارسی ترجمہ بھی اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اپنے زمانہ کے بابالال بیراگی کا بھی معتقد ہو گیا تھا جو دھیان پور (پٹیالہ) کا رہنے والا تھا اور اس کو ایک عارف باللہ سمجھتا تھا اس سے جو اس کی گفتگو ہوئی اس کو اس کے میرنشی چندر بھان برہمن نے مکالمہ داراشکوہ و بابالال بیراگی کے نام سے مرتب کیا اس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ حق و صداقت کسی ایک مذہب کی ملکیت نہیں۔

داراشکوہ نے سنسکرت کی مشہور کتاب یوگ و اسی شست کا بھی ترجمہ اپنے ایک درباری سے کرایا اور اس ترجمہ کی وجہ یہ بتائی:

”اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدردان ان سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے جو اونچے پر کھڑے تھے وہ بشسٹ تھے اور دوسرے رام چندر..... میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا، بشسٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میرے پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چندر! یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے اس سے بغلگیر ہو، رام چندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے اس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تاکہ مجھے کھلا دے میں نے وہ شیرینی کھائی، اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سر نو زیادہ ہوئی اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص اس خدمت پر مقرر ہوا اور ہندوستان کے پنڈتوں سے..... اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا۔ (بحوالہ مقدمہ

رقعات عالمگیری، مرتبہ نجیب اشرف ندوی، و بزم تیموریہ، ج ۳ ص ۲۰۳)

داراشکوہ کی ان تحریروں میں بڑی مذہبی رواداری ہے مگر راج مسلمان اس سے بدظن ہو گئے اور ان کو خیال پیدا ہوا کہ وہ پہلے کی طرح حنفی المسلمک اور سلسلہ قادریہ کا پیرو ہونے کے بجائے ہندو ہونے کی کوشش کر رہا ہے یا کم از کم وہ اپنے عقائد کو ایسے سانچے میں ڈھال رہا ہے کہ ہندو اس کی طرف مائل ہو کر تخت و تاج کے حصول میں اس کے معاون اور مددگار ہوں۔

ہندوؤں نے واقعی اس کو اپنا ہیرو بنا لیا جب تاج و تخت کے لیے شاہ جہاں کے بیٹوں میں جنگ شروع ہوئی تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت فوجی سردار اس کی حمایت میں امنڈ پڑے، پہلے تو وہ راجہ جسونت سنگھ کی رہنمائی میں اورنگ زیب اور مراد کے خلاف دھرم مات میں لڑے اس جنگ میں راجہ جسونت سنگھ کے ہراول میں دس ہزار فوجی تھے جن میں زیادہ تر راجپوت تھے، اس میں مکندر سنگھ ہاڈا، راجہ سبحان سنگھ بندیلیہ، امر سنگھ چندراوت، رتن راٹھور، ارجن کورہ دیال داس جہالا، موہن سنگھ اور دوسرے نامی سردار اپنے سروں کو ہتھیلی پر لے کر کھڑے ہوئے لشکر کے اہمیش میں داس کور، گوردھن راٹھور اور دوسرے جانباڑ راجپوت تھے، قول میں خود راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راجپوت سواروں کے علاوہ بھیم داس ولد راجہ بٹھل داس کور اور دوسرے سرداروں کے ساتھ تھا، میمنہ قول پر راجہ جے سنگھ میسودیہ اپنے بہادر راجپوت سرداروں کے ہمراہ تھا، لشکر کا کیمپ مالو جی، پرسو جی اور راجہ دیہی سنگھ کی نگرانی میں تھا۔ (عالمگیر نامہ ص ۶۲-۶۱)

مگر راجہ جسونت سنگھ کو اورنگ زیب کی سپاہیانہ ہوشمندی اور جنگی بصیرت سے شکست کھانی پڑی، داراشکوہ نے ایک بار پھر سموگڑھ کے میدان میں اپنی قسمت کی بازی لگائی، راجپوت سرداروں نے بھی اس کی خاطر جان بازی کا ثبوت دیا، جتنے آزمودہ کار اور نامور راجپوت فوجی سردار تھے مثلاً چھتر سال ہاڈا، راجہ روپ سنگھ، بیرم دیو میسودیہ، گردھر (راجہ بٹھل داس کا بھائی) بھیم (راجہ بٹھل داس کا لڑکا) راجہ شیورام سنگھ راٹھور، راجہ کشن سنگھ،

پرتھی راج، مہاسنگھ بھدوریہ، رام سنگھ اور کیرت سنگھ وغیرہ سب اس کے ساتھ ہوئے یہ سب اپنی شجاعت اور نبرو آزمائی میں مشہور تھے اور ان کو اپنی جنگی کارگزاریوں پر بڑا ناز تھا، راجہ رام سنگھ راٹھور تو زعفرانی رنگ کا لباس اور مروارید کا ہار پہن کر اس نشہ میں مست آیا تھا کہ مراد اورنگ زیب کو شکست دے کر اور راجپوتوں کی شجاعت کا سکہ جما کر اپنے محبوب شہزادہ داراشکوہ کو تخت پر بٹھا کر رہے گا، چنانچہ غیظ و غضب میں آگے بڑھتا ہوا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچ کر چلایا تو دارا کے مقابلہ میں بادشاہی کی ہوس رکھتا ہے؟ مگر وہ مراد کے تیروں سے ہلاک ہوا، دوسری طرف راجپوت سرداروں نے اورنگ زیب کو ہلاک کرنے میں جس ملیش اور تہور کا اظہار کیا اس سے ان کے جذبہ سرفروشی کا اندازہ ہوتا ہے مگر اورنگ زیب کی پامردی کے سامنے ان کی بہادری بیکار ثابت ہوئی، راجپوتوں کے تمام نامور سردار مثلاً راجہ روپ سنگھ، چھتر سال ہاڈا، بھرت سنگھ، موکم سنگھ، رام سنگھ راٹھور، بھیم سنگھ گوڑا اور شیورام وغیرہ ایک ایک کر کے دارا کی خاطر مارے گئے مگر دھرمات اور سموگڑھ کی دونوں لڑائیاں اس لحاظ سے یاد رکھی جائیں گی کہ راجپوت اپنے ایک محبوب حلیف کے لیے ہر قسم کی قربانی کر سکتے تھے۔

ان لڑائیوں کے بعد داراشکوہ کا وہی انجام ہوا جو ایک مغلوب حریف سلطنت کا ہوا کرتا ہے مگر وہ اکبر کے ساتھ اپنا یہ پیغام بھی مورخوں کے لیے چھوڑ گیا ہے کہ یہ کوشش محض شورش بے دعا ہے کہ ہندومت اور اسلام کو ملا کر ایک ایسا مذہب قائم کیا جائے جو سب کو متحد کر کے سب کو خوش رکھے، تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایسے ملے جلے مذہب سے چند لوگوں کے سوا عام لوگ خوش نہیں رہ سکتے اور نہ یہ قابل قبول ہوتا ہے، داراشکوہ اگر اپنے باپ اور دادا کی طرح اپنی محبت، اخلاص اور فراخ دلی سے ہندوؤں کے دلوں کی تسخیر کرتا رہتا تو ممکن ہے کہ اورنگ زیب سے بازی لے جاتا لیکن جو غلطی اکبر نے کی تھی اس نے بھی کی، یا اگر وہ خالص موحد بننے پر اکتفا کر لیتا تو اپنی وسیع المشرقی اور رواداری کی وجہ سے کبیر، جے دیو، راماما ند

اور چٹین وغیرہ کی صف میں نمایاں جگہ پالیتا لیکن موحد اور عارف باللہ ہو کر تخت و تاج کا دعویٰ دار ہوا تو اس کے مذہبی رجحانات اور روحانی میلانات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا، راسخ مسلمان اور رنگ زیب کی طرف جھک پڑے، وحدت ادیان کا تخیل نظری حیثیت سے تو بہت دلکش ہے، اس پر خیال کی رعنائی اور تحریر کی دلاویزی کا اظہار کتابوں کے صفحات پر بہت اچھی طرح کیا جاسکتا ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خدا کے تخیل، اس کی ہستی، اس کی صفات کاملہ، اس کی عبادت پھر حقوق انسانی، اچھے اور برے اعمال کی جزا و سزا میں ازلی سچائی اور ابدی صداقت میں سارے مذاہب کی تعلیم یکساں ہے، ادیان کی وحدت یہاں تک تو ساتھ دے دیتی ہے مگر جب شرع، منہاج، مسلک اور جزوی احکام کا سوال آتا ہے تو یہ ہر مذہب کی زمانی اور مکانی خصوصیات کے سبب بدلتے رہے ہیں اور یہیں سے ادیان کی وحدت ختم ہو جاتی ہے جن کو ہر مذہب کے پیرو کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کرتے اسی لیے عملی زندگی میں وحدت ادیان کا تخیل ناکام اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیوں کہ مذہب کے شرعی منہاج اور مسلک کے سامنے ہندومت اور اسلام کے امتزاج کی کوشش بے کار ہو جاتی ہے، تاریخ کا یہی فیصلہ رہا ہے اور پھر اس تاریخی حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اکبر کی مذہبی سرگرمیوں کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نمودار ہوئے اور داراشکوہ کے بعد مسلمانوں کے ذہن پر اورنگ زیب چھا گیا، اکبر کے خلاف رانا پرتاپ اٹھ کھڑا ہوا اورنگ زیب سے سیواجی برسر پیکار ہوا تو ہندوؤں کے قومی اور مذہبی جذبات ایسے ابھرے کہ یہ دونوں ان کے ہیرو ہو گئے، مسلمانوں کے جذبات ان دونوں ہندو ہیروؤں کے خلاف کچھ بھی ہوں لیکن ہندوؤں کے جذبات سے چشم پوشی کرنا فعل عبث ہوگا اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی اورنگ زیب کے خلاف ہندوؤں کے جو بھی جذبات ہوں وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنے کے بجائے اگر ان کے خلاف اشتعال انگیز تحریریں لکھیں تو یہ دل آزاری اور نا سمجھی ہوگی، رواداری اور سمجھداری نہ ہوگی۔

شاہ جہاں کی حکومت کی نوعیت: شاہ جہاں کے عہد تک کی مغل حکومت کو کے۔ ام۔ بینکر قومی بادشاہت سے تعبیر کرتے ہیں اور گو وہ عالمگیر سے خوش نہیں ہیں، اس پر مذہبی غیر رواداری کا الزام رکھتے ہیں پھر بھی لکھتے ہیں کہ:

”اکبر نے اپنے جانشینوں کے لیے اپنی حکمت عملی کے سلسلہ میں تین باتیں چھوڑیں۔ ۱۔ ریاست قومی ریاست بنی رہے۔ ۲۔ ہندوؤں سے میل ملاپ رہے۔ ۳۔ پورے ہندوستان کو متحد کیا جائے اس کے تین جانشینوں کی تاریخ کا مطالعہ اسی روشنی میں کیا جائے، پہلی دو باتوں پر جہانگیر اور شاہ جہاں نے عمل کیا گودل سے نہ کیا ہو لیکن اورنگ زیب نے ان کی قصداً خلاف ورزی کی لیکن ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش تینوں نے کی اس سے کبھی باز نہیں آئے گوان کو پورے طور پر کامیابی نہیں ہوئی، دکن میں لڑائیاں برابر لڑنی پڑیں جو کبھی ختم نہیں ہوئیں، اس سے پورے امپائر پر بڑا بوجھ پڑا اس کا خزانہ خالی ہوتا رہا، اورنگ زیب تو اسی سلسلہ میں جاں بحق ہوا مگر یہ لڑائیاں ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش ہی میں لڑی گئیں۔“ (اے سورے آف انڈیا، ص ۱۵۹)

اگر اوپر کے اقتباس میں گودل سے نہ کیا ہو ”اورنگ زیب نے قصداً خلاف ورزی کی“ نہ لکھا جاتا تو کے۔ ام۔ بینکر جیسے دیدہ ورمورخ کی رواداری کا پورا ثبوت ہوتا ان دونوں جملوں کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے مورخوں کا ذہن کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ضرورت ہو یا نہ ہو بظاہر معروضی مطالعہ اور صحیح تحقیق کے نام پر ایسی باتیں ضرور لکھ جاتے ہیں جو ممکن ہے کہ ان کے خیال میں معروضیت اور تحقیق ہو لیکن اس کی حیثیت نیش زنی اور نوک سوزن میں بھی منتقل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر بنارس پرشاد سکسینہ (سابق استاذ الہ آباد یونیورسٹی) نے ”ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی“ لکھی ہے اس میں شاہ جہاں اور اس کے عہد پر جو مورخانہ تبصرہ کیا ہے ہم

اس کو یہاں پر اس لیے درج کرتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو کہ گذشتہ دور کے ایک مسلمان حکمران کی حکومت کو موجودہ دور کے ایک ہندو مورخ نے کس نظر سے دیکھا ہے یہ اقتباس ذرا طویل ہے ناظرین سے اس کی طوالت کے لیے معذرت ہے مگر وہ اس حیثیت سے مطالعہ کریں کہ جاندار، شاندار اور باوقار حکومت محض مندروں کو منہدم کر کے اور ہندوؤں کو فروتر سمجھ کر قائم نہیں ہو سکتی تھی، یہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ سے ممکن ہوئی جس میں سیاسی فراخ دلی، مذہبی رواداری اور وسیع الشمولی کو بڑا دخل تھا یہ تحریر اس لیے بھی نقل کی جا رہی ہے کہ اگر موجودہ دور کے مورخین تاریخ نویسی میں اپنے مذہبی، نسلی اور غیر روادارانہ جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے ٹھنڈے جذبات سے ٹھنڈی اور روادارانہ تحریریں لکھیں تو موجودہ دور میں جس جذباتی ہم آہنگی کی ضرورت ہے وہ ضرور پوری ہوتی رہے۔

شاہ جہانی دربار: شاہ جہانی دربار اپنی شاہانہ شوکت و حشمت کے لحاظ سے منتہائے کمال پر تھا اور اس کے عہد میں مغل سلطنت میں بڑی خوشحالی اور دولت کی فراوانی تھی، ہندوستان کے تمول کی شہرت سن سن کر بیرونی ممالک کے سیاح یہاں بکثرت آتے اور شاہنشاہ کے جاہ و جلال کو دیکھ کر چکا چوندھ ہو جاتے اس کے دربار کا تزک و احتشام ان کے تخیل سے بہت زیادہ ہوتا تھا اور وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے، برنیر، ٹوریز اور منوکی نے اپنے تاثرات اپنی کتابوں میں قلم بند کیے ہیں اگرچہ ان میں بہت سی باتیں غیر معتبر بھی ہیں پھر بھی ان کے بیانات سے مغل دربار کے عجائبات کا کچھ نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

شاہنشاہ کی ذات: دربار کے سطوت و عظمت کا مظاہرہ شاہ جہاں کی ذات سے ہوتا تھا وہ اپنے جلال و جبروت کے باوجود بڑا ہی محنتی اور جفاکش تھا اور ستھرائی کا بڑا خیال رکھتا تھا، نماز کا بڑا پابند تھا اور جب رمضان شریف میں دارالسلطنت میں رہتا تو روزے بھی پابندی سے رکھتا، رمضان کی راتوں میں تراویح بھی پڑھتا اور خیرات تقسیم کیا کرتا، عطر کا دلدادہ تھا اس کے کپڑے ہمیشہ عطر میں بے رہتے تھے، گفتگو میں بڑا خلیق اور متواضع تھا، ادنیٰ سے ادنیٰ کو

بھی تو سے مخاطب نہ کرتا، طلوع آفتاب سے دو گھڑی پہلے جاگتا، غسل اور وضو کر کے اپنی خاص مسجد میں چلا جاتا اور مصلے پر بیٹھ کر فجر کی نماز کے وقت کا انتظار کرتا، نماز کے بعد طلوع آفتاب تک تسبیح پڑھتا رہتا، سفر میں نمازیں خیمہ کے اندر ہی ادا کرتا، مسجد سے نکل کر درشن کے لیے جھرو کے پر آ کر کھڑا ہو جاتا، اس کی ابتدا اکبر ہی کے زمانہ سے ہوئی تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ رعایا کا تعلق بادشاہ سے براہ راست رہے اور وہ اس کو دیکھ کر مطمئن رہے کہ بادشاہ صحیح و سالم اور تندرست ہے، درشن کے موقع پر رعایا کو عام اجازت تھی کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر حکومت کے بڑے حکام کے خلاف عدل و انصاف طلب کر سکے، اس وقت شہنشاہ پوری توجہ سے اپنے رعایا کی ساری شکایتیں سنتا اور بڑے بڑے حکام کو سخت سے سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہ کرتا اور یہ مغل حکومت کا ایک قابل تعریف پہلو ہے کہ رعایا کو انصاف حاصل کرنے کی اتنی سہولت حاصل تھی۔

دیوان عام: جھرو کہ سے بادشاہ دیوان عام میں آتا یہ سنگ سرخ کی ایک شاندار عمارت تھی جو چالیس ستونوں پر بنائی گئی تھی یہ تین طرف کھلا ہوا صحن تھا، چوتھی طرف جالی دار دیوار تھی جس کے وسط میں بڑے ہال کی سطح سے اوپر سفید سنگ مرمر کا ایک تخت تھا جس میں مختلف قسم کی اعلیٰ صنعتیں دکھائی گئی تھیں، آگرہ کا دیوان عام سادہ ہے اس میں دہلی کے دیوان عام کی جیسی ترصیح و آرایش نہیں، لاہور کے قلعہ میں بھی ایک دیوان عام ہے۔

اس دیوان میں بڑے بڑے عہدہ دار، درباری لشکری ترتیب کے ساتھ کھڑے ہو کر بادشاہ کی آمد کا انتظار کرتے رہتے ان کی نظریں تخت پر جمی رہتیں، دیوان کے حاشیہ کے بیرونی حصہ میں چاندی کا کٹ گھرہ تھا جس کے اندر دو صدی سوار سے اوپر کے منصب دار داخل ہو سکتے تھے، وہ کھڑے کھڑے تخت کو ٹٹکی باندھے دیکھتے رہتے، ستونوں کے پاس معزز منصب داروں کی جگہیں متعین تھیں ان کے ارد گرد دو رچی شاہی جھنڈے اور علم لیے کھڑے رہتے ان کی پشت دیوار کی طرف ہوتی، تخت کے دائیں بائیں سلطنت کے بڑے

بڑے ارکان ہوتے جو بادشاہ کے حضور میں کاغذات پیش کرنے کے لیے تیار رہتے، چاندی کے کنگھڑے کے بعد کی جگہ لکڑی سے گھری ہوتی اور یہ لکڑیاں سرخ رنگ کی ہوتیں یہ جگہ دو صدی سوار سے کم درجہ کے منصب داروں کے لیے مخصوص ہوتی، ان حدود میں تین پھانکوں سے ہو کر داخلہ ہوتا تھا جہاں گرز برداروں کا پہرہ ہوتا تھا۔

دیوان عام میں بادشاہ کا درووسات بیچ کر چالیس منٹ پر ہوتا اس کے تحت پر جلوہ افروز ہوتے ہی میر بخشی منصب داروں کی عرض داشتیں پیش کرتا اور ان منصب داروں کو سامنے لاتا جن کی ترقی ہونے کو ہوتی جو منصب دار باہر بھیجے جاتے ان کو خلعت عطا کیا جاتا، اس کے بعد صدر الصدور کی طرف سے غربا، مساکین کی درخواستیں پیش ہوتیں اور پھر علما و صلحا کا تعارف کرایا جاتا اس کے بعد میر سامان اور دیوان بیوتات اپنے اپنے شعبوں کے کاغذات پیش کرتے اس کے بعد اادیوں کے بخشی، میر آتش اور مشرف توپ خانہ اپنے اپنے محکموں کے بھرتی ہونے والے ملازموں کی پیشی میں لاتے اس کے بعد دربار کے معزز منصب دار، صوبہ داروں، بخشوں اور دیوان کی عرض داشتوں سے بادشاہ کو باخبر کرتے، بادشاہ ان کو خود پڑھتا اور ان پر احکام جاری کرتا سب سے آخر میں عرض مکرر منصب، جاگیر اور نقدی کے متعلق عرضیوں کو پیش کرتا جب یہ سارے کام ختم ہو جاتے تو حاضرین کی ضیافت ہاتھیوں اور گھوڑوں کی نمائش سے کی جاتی۔

دیوان خاص: اس کے بعد بادشاہ دیوان عام سے دیوان خاص میں آتا جہاں دو گھنٹے رہتا جو کام انتظامی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر دیوان عام کے کھلے دربار میں انجام پانے کے قابل نہ ہوتے وہ دیوان خاص میں انجام پاتے اس وقت صرف وزیر حاضر ہوتے تھے، بادشاہ مختلف عرض داشتوں کو سن کر ان پر یا تو دست خاص سے احکام جاری کرتا یا لکھوادیتا، ضرورت مندوں کی مدد و معاش کی منظوری یہیں سے دی جاتی، مصوری اور جواہرات کے نادر نمونے بھی اس وقت پیش کیے جاتے، داروغہ عمارات مختلف شاہی عمارتوں کے نقشے بھی اسی وقت



پیش کرتا باہر سے جو باز، شکرے اور پالتو چیتے آتے وہ بھی یہیں لا کر نذر کیے جاتے۔

شاہ برج: دیوان خاص سے بادشاہ برج میں آتا جہاں انتہائی راز کی باتیں ہوتیں یہاں شاہزادے یا دو چار مخصوص شاہی حکام کے علاوہ اور کسی کو بار نہ ہوتا، تمام پوشیدہ احکام یہیں سے صوبوں میں بھیجے جاتے خالصہ، طلب اور تنخواہ سے متعلق بعض امور یہیں طے پاتے۔

حرم: شاہ برج سے بادشاہ دوپہر کے وقت حرم میں جاتا، خاصہ تناول کر کے قیلولہ کرتا جب وہ اٹھتا تو ممتاز محل غربا و مساکین کے لیے خیرات اور امداد کی سفارشات کرتیں، غریب اور مفلوک الحال لڑکیوں کے جہیز کے سامان کا حکم اسی وقت جاری ہوتا، بعض لڑکیوں کی شادیاں بھی شاہی خرچ سے انجام پاتیں، پیسوں اور پیواؤں کے روزینے مقرر ہوتے، محل میں جو بھی احتیاج لے کر جاتا وہ محروم واپس نہ ہوتا اور روزانہ بڑی بڑی رقمیں غربا کی امداد میں خرچ ہوتی رہتی تھیں۔

شام کے مشاغل: بادشاہ تین بجے سہ پہر کو محل سے باہر آ جاتا کبھی کبھی دیوان عام میں آ کر محل کے محافظ سواروں کا معائنہ کرتا لیکن عموماً محل سے نکل کر عصر کی نماز کے لیے مسجد میں چلا جاتا، نماز عصر کے بعد دیوان خاص میں آ جاتا جہاں انتظامی امور کے متعلق پھر مشورہ کرتا اس وقت کبھی موسیقی سن کر یا ہرنوں کی لڑائی دیکھ کر تھوڑی سی تفریح بھی کر لیتا، دیوان خاص میں جس وقت بڑی بڑی قندیلیں روشن کی جاتیں تو ان کی روشنی سے زربفت اور کم خواب کے پردے اور فروش جگمگاٹھتے، دیوان خاص کی گونا گوں دلاویزیوں ہی کو دیکھ کر اس کی دیوار پر یہ شعر لکھ دیا گیا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

خواب گاہ: آٹھ بجے شاہ برج میں بھی بادشاہ آدھے گھنٹے کے لیے آتا پھر حرم میں جا کر رات کا خاصہ تناول کرتا اس کے بعد کنیزوں کے گانے سنتا دس بجے بستر پر چلا جاتا پردے کی آڑ سے اچھی اچھی کتابیں پڑھوا کر سنتا رہتا جس میں زیادہ تر بزرگان دین کی سوانح عمریاں

اور سفر نامے ہوتے تھے، بابر کی تزک اس کو بہت پسند تھی۔

انصاف کا دربار: جمعہ کو دربار نہ ہوتا تھا، بدھ کو بادشاہ جھرو کہ سے دیوان خاص میں جاتا اور عدل و انصاف کے لیے دربار منعقد کرتا، بادشاہ فیروز تخت پر بیٹھتا اور مفتی اور فقہا کی موجودگی میں داروغہ عدالت کے مقدمے پیش کرتا، بادشاہ مدعی کی باتیں غور سے سن کر شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا۔

ترتیب و نظم: دربار میں نظم و ترتیب کا غیر معمولی لحاظ رکھا جاتا اس میں کسی قسم کا فرق آنے نہ دیا جاتا تمام منصب دار اپنے اپنے مناسب کے مطابق کھڑے رہتے، صرف شاہزادوں کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی مگر ان کو بھی بیٹھتے وقت بادشاہ سے اجازت لینا پڑتی، جہانگیر نے شاہ جہاں کے لیے دربار میں ایک طلائی کرسی رکھوائی تھی اسی خصوصیت کا اظہار شاہ جہاں نے اپنے فرزند ارجمند داراشکوہ کے لیے کیا تھا، صرف وزیر اور میر بخشی کو تخت کے زینے پر چڑھنے کی اجازت تھی، بقیہ امر تخت سے دور کھڑے رہتے اور احترام کا اظہار زمین بوس ہو کر اور چار تسلیم بجا کر کرتے زمین بوسی میں امر اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین کو چھوتے اور پھر دونوں ہاتھوں کو پیشانی تک لے جاتے اور چار تسلیم میں جھک کر اپنی پیشانی، آنکھوں اور دونوں بازوؤں کو ہاتھوں سے چھوتے، شاہ جہاں نے سجدہ کی رسم ترک کرادی تھی پھر زمین بوسی کو بھی چھوڑ کر صرف چار تسلیم بجالانے کا حکم دیا تھا، علماء و فضلا تسلیم بجالانے سے مستثنیٰ تھے اور صرف السلام علیکم کہنے پر اکتفا کرتے تھے، بادشاہ جب جھرو کہ پر یا دربار میں آتا تو ”شاہ زندہ باد“ کے نعرے لگائے جاتے اگر بادشاہ کسی سے کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کی طرف اشارہ کرتا، گرز بردار اس کو اپنے ساتھ لے جا کر تخت کے سامنے کھڑا کر دیتا وہ تعظیم بجالاتا اور نہایت ادب سے بادشاہ کی باتیں سننے کا منتظر رہتا اگر بادشاہ اس کو کوئی خلعت ادا کرتا تو وہ اس کو جھک کر لیتا اور انتہائی تعظیم سے پیچھے ہٹتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آ جاتا، تخت کی طرف پیٹھ کرنا بدتمیزی سمجھی جاتی تھی۔

جشن: دیوان عام اور دیوان خاص یوں تو روزانہ دلاویزیوں سے معمور رہتے تھے لیکن جشن کے موقع پر ان کی زینت، آرائش، رنگینی، سجاوٹ اور جگمگاہٹ کی کوئی حد باقی نہیں رہتی تھی یہ جشن نوروز، جانشینی کی سالگرہ، عید، بقر عید، شب برأت وغیرہ کے مواقع پر منعقد کیا جاتا، طلائی شامیانے کے نیچے امر اپنے زرق برق لباس میں جمع ہوتے بادشاہ ہیرے موتی اور جواہرات سے مرصع ہو کر تخت پر بیٹھتا اور نذرانے قبول اور انعامات تقسیم کرتا۔

دربار کی عجائبات: شاہ جہانی دربار کے نوادر میں سب سے اہم تخت طاؤس تھا، بٹوریز اس کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا اور اس کی پوری قلمی تصویر کھینچی ہے دوسری عجوبہ چیز کونور تھی جس کو میر جملہ نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

کلچر کی ترقی: لیکن دربار محض تزک و احتشام اور شان و شوکت ہی کی غرض سے منعقد نہیں کیا جاتا اس کی زینت و آرائش دراصل دربار کو کلچر کے فروغ کا بڑا خیال رہا، حکومت نے ہر جگہ امن قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے آرٹ اور لٹریچر کو خود بخود ترقی ہونے لگی پھر شاہانہ سرپرستی نے اس کو اور بھی آگے بڑھایا، شعرا، فضلا، فلسفی اور دوسرے ارباب کمال سرپرستی کا شہرہ سن کر دربار میں آتے اور ان میں کوئی محروم واپس نہ جاتا، بادشاہ ان سب کو اپنے الطاف و اکرام سے نوازتا اس کی تقلید امر بھی کرتے اور ہر امیر فیاضی دکھانے میں دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا، بعض امر خود بھی اہل علم تھے علی مرادون خاں، سعد اللہ خاں، سعید خاں، ظفر خاں، میر جملہ، افضل خاں اور راجہ جے سنگھ وغیرہ نہ صرف تلوار کے دھنی تھے بلکہ علوم و فنون کے بھی برے مربی تھے اور وہ جہاں گئے اپنے ساتھ دربار کی روایات لے گئے اور مختلف صوبوں میں جا کر علوم و فنون کو ترقی دی۔

تعلیم: آگرہ اور دہلی میں دو تعلیمی اداروں کے اخراجات کا بادشاہی حکومت پر تھا اور اس کے اساتذہ کا تقرر بادشاہ کیا کرتا تھا، عوام کی تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے نہ تھا گواہی مسجدوں میں حکومت جاگیریں وقف کرتی رہتی تھی جہاں طلبہ تعلیم پایا کرتے تھے لیکن نجی اور

انفرادی کوششوں سے مدارس کی کمی نہ تھی، جہانگیر کے زمانہ میں ہر گاؤں اور ہر قصبہ میں مدرسے تھے، عام طور سے علما و صلحا ہی مدارس میں کوئی اجرت لیے بغیر تعلیم دیا کرتے تھے یا اگر اجرت لیتے بھی تھے تو وہ بالکل نام کی ہوتی، ایسے تعلیمی ادارے لاہور، احمد آباد، برہان پور اور جون پور میں بہت تھے، شاہ جہانی عہد میں مشہور اساتذہ و علما سر ہند تھانیسور اور انبالہ میں رہا کرتے تھے جن کے پاس دور دور مقامات سے طلبہ آتے رہتے تھے، کشمیر بھی علوم کا اہم مرکز بن گیا تھا اس کی خوشگوار آب و ہوا، پرامن فضا اور دلآویز مناظر کی بنا پر بہت سے ارباب علم یہاں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے، ملا حسن فروغی اور ملا محسن کشمیر ہی کے تھے، خواجہ خداوند محمود یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے، ملا شاہ یہاں اکثر آتے رہتے تھے، کلیم اور قدسی نے یہاں رہ کر بادشاہ نامے منظوم کیے۔

تعلیمی نصاب میں بہت سے مضامین ہوتے جن کو لائق اساتذہ ہی پڑھاتے، ہر مفید اور اہم مضمون کی تھوڑی تھوڑی چیزیں ضرور پڑھادی جاتیں، مذہبی اور ما بعد الطبیعیاتی مضامین کی اہمیت ضرور تھی لیکن تاریخ، ریاضی، عروض اور خوش نویسی کی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا، امتحانات کا رواج نہ تھا، ممتاز اساتذہ کے سامنے زانوائے تلمذتہ کرنا کافی ہوتا۔

اس عام تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ علمی سرگرمیاں برابر قائم رہیں، فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی اس لیے اس کی سرپرستی ہوتی رہی اور اس میں گونا گوں قسم کے علوم پیدا ہوئے۔

شعرا: اس سرپرستی کا شہرہ سن کر ایران سے بہ کثرت شعرا ہندوستان آئے، دربار میں جب کوئی تقریب ہوتی تو شعرا اپنے اپنے ذہن و اختراع کے نمونے پیش کرتے اور ایک دوسرے سے بازی لے جاتے، دربار کا سب سے قدیم شاعر سعیدائے گیلانی تھا جو داروغہ زرگر خانہ کے عہدہ پر بھی مامور تھا اس کے بعض تاریخی قطعات بہت مشہور ہوئے، ابوطالب کلیم دربار کا ملک الشعرا تھا وہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا اور شاہ جہانی عہد میں اس کو

ملک الشعرا بنا کر سب سے بڑا علمی اعزاز عطا کیا گیا، شاہ جہاں کی شان میں اس کے بہت سے قصائد ہیں اس نے بادشاہ نامہ کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی اور ظفر خاں حاکم کشمیر کے لیے ایک ساقی نامہ قلم بند کیا، حاجی محمد جان قدسی کے اشعار بھی بہت پسند کیے جاتے تھے اس نے بھی ایک بادشاہ نامہ لکھا اس نے کشمیر کے چمنستان کی بھی ایک قلمی تصویر کھینچی ہے اور پھر شاہ جہاں کی تمام عمارتوں پر نظمیں لکھیں جن میں تاریخیں بھی ہیں، مرزا محمد صائب اپنے خاص اور نئے طرز کے لیے شاہ جہانی دربار میں بہت مقبول ہوا گو وہ یہاں آخر وقت تک مقیم نہیں رہا، آخر میں ایران چلا گیا تھا، حسن بیگ رفیع کو اپنے اشعار کی داد و بار میں خوب ملتی تھی، باہر سے آنے والے شعرا میں سلیم طہرانی، حکیم رکن الدین کاشی اور فاروقی بھی قابل قدر شعرا تھے۔

ہندوستان میں فروغ پانے والے شعرا میں ابوالبرکات کا نام ممتاز تھا، ملا شیدا اپنی ہجو گوئی اور ذہانت کے لیے مشہور تھا اس نے اپنے معاصرین شعرا قدسی اور میر الہی کی سخت ہجو کی اس نے اپنی مثنوی دولت بیدار، مخزن، گنجور کے طرز پر لکھی، چندر بھان برہمن نامی ایک ہندو شاعر لاہور کا رہنے والا تھا وہ اپنی رواداری اور وسعت نظر کے لیے پسند کیا جاتا تھا اس کو اچھی نثر اور اچھی نظم لکھنے میں بڑی مہارت تھی اس نے ابوالفضل کے طرز انشا کی تقلید بڑی خوبی سے کی ہے اس کی کتاب چہار چمن مرصع و مسجع عبارت آرائی کا نمونہ ہے، حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھتیجا حکیم حازق بھی اس عہد کے مقبول شاعر تھا وہ اپنے اشعار بڑے سوز و گداز کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، حافظ محمد خیالی کے متعلق طبقات شاہ جہانی کے مؤلف کا خیال ہے کہ وہ انوری کا ہم پلہ تھا وہ امر کی مداحی سے پرہیز کیا کرتا تھا وہ ہیبت، نجوم اور ریاضی کا بھی عالم تھا، محمد علی ماہر کے اشعار میں بڑی سلاست اور شگفتگی ہوتی تھی۔

نثر: اس عہد میں نثر نگاری کی بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی، شاہ جہاں اپنی افتاد طبع کے مطابق چاہتا تھا کہ اس کے عہد کی تاریخ نہایت شاندار طریقہ پر لکھی جائے، پہلے تو اس نے حکیم

حاذق اور ملا عبداللطیف گجراتی کو اس کام کے لیے مامور کیا لیکن دونوں میں بڑی چٹمک پیدا ہو گئی۔ اس لیے شاہ جہاں نے ان کو اس کام سے علاحدہ کر دیا انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا اب کہیں پتہ نہیں، ایمنائی قزوینی کی بعض تحریریں شاہ جہاں کو بہت پسند آئی تھیں اس لیے اس کو یہ خدمت سپرد کی لیکن وہ شاہ جہانی دور کے ابتدائی دس سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ اس کو بھی علاحدہ ہونا پڑا اس تاریخ کا نام بادشاہ نامہ ہے اس کی زبان سادہ اور شگفتہ ہے تاریخی حیثیت سے ایک اہم تالیف ہے ۱۶۴۰ء میں جلال الدین طباطبائی نے بھی بادشاہ نامہ کے نام سے ایک تاریخ لکھی اس کا جو حصہ محفوظ ہے اس میں شاہ جہانی حکومت کے پانچویں سال سے آٹھویں سال تک کا ذکر ہے اس کی عبارت ضرورت سے زیادہ مرصع ہے ۱۶۴۸ء میں عبدالحمید لاہوری نے بھی شاہ جہاں کے حکم سے بادشاہ نامہ لکھا اس میں شاہ جہانی عہد کے شروع کے بیس سال کی تاریخ ہے۔

عبدالحمید لاہوری نے ابوالفضل کے طرز میں کتاب لکھنے کی کوشش کی لیکن بعد میں اس طرز کو چھوڑ دیا وہ اپنی ضعیفی کی بنا پر پورے عہد کے کوائف قلم بند کرنے سے معذور ہو گیا تو اس کے شاگرد محمد وارث نے بقیہ حالات لکھے اس کی تاریخ کا بھی نام بادشاہ نامہ ہے اس میں شاہ جہاں آباد کی عمارتوں کا ذکر دلاویز طریقہ پر کیا گیا ہے، محمد صادق نے شاہ جہاں نامہ کے نام سے ایک غیر سرکاری تاریخ لکھی جو اپنے معلومات کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے، محمد صادق داروغہ غسل خانہ کے عہدہ پر مامور تھا اس کا ایک چچا اسحاق بیگ یزدی ممتاز محل کا میر سامان تھا، دوسرا چچا امیر خاں میر تزک اور تیسرا باقی خاں اکبر آباد کا حاکم تھا اس لیے اس کو ہر قسم کے معلومات حاصل ہوتے رہے اور گو اس کی تاریخ غیر سرکاری ہے لیکن مستند ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، محمد طاہر آشنا کی تلخیص شاہ جہانی عہد کے تیس سال کی مکمل تاریخ ہے، آثار الامرا کے مصنف شاہ نواز خاں نے اس کے ادب و انشا کی تعریف کی ہے اگرچہ اس نے اپنے عہد کے مورخوں کے لکھے ہوئے تاریخی واقعات کی تلخیص ہی کر دینے پر اکتفا کیا ہے ۱۶۵۹ء میں

محمد صالح کنبوہ نے شاہ جہانی عہد کی تاریخ عمل صالح کے نام سے قلم بند کی اس کی عبارت بڑی ہی مرصع ہے ۱۶۴۰ء میں شاہ جہانی نے ملفوظات تیموری پیر محمد افضل بخاری سے نظر ثانی کرا کے اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کرایا۔

مراد جب بلخ کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کا حال ملاطغرائی نے مرآة الفتوح کے نام سے لکھا اسی نے کشمیر کی تعریف میں فردوسیہ کے نام سے ایک کتاب قلم بند کی پھر شہزادہ مراد کی دربار میں تاج المدائح اور شاہ شجاع کی تعریف و توصیف میں کنز المعانی لکھی۔

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھی گئیں مثلاً منیر جون پوری نے ہرمز کے شہزادہ والا اختر کا ایک قصہ لکھا جو بہت ہی مرصع زبان میں ہے۔

**لغت:** لغت میں چار کتابیں شاہ جہاں کے نام سے معنون ہوئیں ان کے نام یہ ہیں: فرہنگ رشیدی اور منتخب اللغات شاہ جہانی از عبد الرشید ٹھٹھوی، چہار عنصر دانش از امان اللہ، شاہد صادق، مؤخر الذکر سائنس، مذہب، فلسفہ، سیاست، اخلاق اور نقشہ عالم کی قاموس ہے۔

**ترجمے:** داراشکوہ سنسکرت زبان کا بڑا قابل قدر عالم تھا اس نے اپنشد، بھگوت گیتا اور یوگ و ششٹ کے ترجمے فارسی میں کیے اس کے سکریٹری بنوالی داس نے پر بھودہ چندراودے کو فارسی میں منتقل کر کے اس کا نام گلزار حال رکھا اور ابن ہر کرن نے راماین کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

**مذہبی کتابیں:** اس عہد میں مذہب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں داراشکوہ کو سفینۃ الاولیاء اور محسن فانی کی دبستان المذاہب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

**طب:** اس زمانہ میں بہت سے قابل قدر اطباء پیدا ہوئے جن کو طب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی بڑا درک حاصل تھا، حکیم علیم الدین وزیر خاں دربار کا طبیب تھا وہ لاہور میں پیدا ہوا اور حکیم دوائی سے طب کی تعلیم پائی اس کی نباضی مشہور تھی، شاہ جہاں کا بڑا مزاج شناس تھا، مختلف عہدوں مثلاً دیوان بیوتات، خاں سامان اور میر عرض کے عہدوں پر مامور رہا پھر بیچ ہزاری منصب دار بنا کر پنجاب کا حاکم اعلیٰ بنایا گیا، حکیم مومنہ شیرازی بھی دربار

کے اطباء میں تھا اور اپنے پیشہ میں بڑا ماہر اور مقبول رہا، شاہ جہاں نے اس کو دو ہزاری منصب عطا کیا، حکیم فتح اللہ شیرازی تشخیص الامراض اور علم الادویات میں بڑا ماہر تھا، حکیم صدر، حکیم ابوالقاسم اور حکیم رکنا کاشی بھی دربار کے ممتاز اطباء تھے، جراحی میں جگ جیون اور شیخ قاسم کو مقبولیت حاصل تھی۔

نجوم و ریاضی: اس عہد کے سب سے بڑے منجم ملا فرید تھے انہوں نے ایک زیچ شاہ جہانی کے نام سے مرتب کی تھی، عطاء اللہ نے ریاضی پر ایک کتاب لکھی اور شاہ جہاں کے نام سے معنون کی، عبدالرشید نے بیخ گنت کا ترجمہ فارسی میں کیا، ریاضی کے اور دوسرے ماہرین کے نام یہ تھے:

مولانا محمود جون پوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری اور میر شمس الدین خلجانی۔

دیگر علوم: فقہ، مذہب، اخلاق، فلسفہ، عمرانیات وغیرہ مضامین عام طور پر بڑے شوق سے پڑھے جاتے، ہر گانوں اور ہر قصبہ کی مسجد میں ایک ملا ان مضامین کے مطالعہ میں مصروف رہتا اس عہد کے مشہور علما میں ابوالکارم ملا حیدر کشمیری، ملا عبدالسلام لاہوری، مولانا حسن دہلوی اور شیخ عبدالحق دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندی: ہندی زبان و ادب کی ترقی میں یہ عہد زیادہ اہم اور شاندار ہے، شاہ جہاں ہندی آسانی سے بول سکتا تھا وہ ہندی موسیقی کا شائق، ہندی زبان کے شعرا کا سر پرست رہا، دربار کے ہندی شعرا کے نام سندرداس، چننامنی اور کاوندرا آچاریہ تھے، سندرداس گوالیار کا رہنے والا تھا شاہ جہاں نے اس کی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت و صلاحیت کے لحاظ سے اس کو مہاکوی رانے کا خطاب عطا کیا اس کو کبھی کبھی سفارتی مشن پر بھیجا جاتا تھا، جھنجر سنگھ نے بغاوت کی تو سندرداس ہی اس کے پاس قاصد بنا کر بھیجا گیا اس نے ہندی شاعری کے آرٹ پر سندرسرنگار کے نام سے ایک کتاب لکھی، سنگھاسن بتیسی اور بارہ ماسا بھی اسی کی تصانیف ہیں، چننامنی نے ہندی شاعری میں ایک نئی شان پیدا کی اور یہ اپنے عہد کا سب



سے بڑا شاعر تھا شاہ جہاں نے اس کی پوری سرپرستی کی اس کی تصانیف کے نام چھدو چار، کاویادی دک، کوی کول کا پترو اور کاویا پرکاش ہیں اس نے ایک راماین بھی لکھی جس کے چھند مشہور ہیں، کاوند آچار یہ نے شاہ جہاں اور اس کے شہزادوں کی تعریف میں ”کاندر کال پلٹا“ منظوم کی اس کی شاعری میں اودھی اور برج بھاشا کی بڑی دلاویز آمیزش ہے وہ سنسکرت کا بھی ایک اچھا شاعر تھا اور یوک و نخت کی تشریح لکھی۔

عمار تیں: لیکن اس عہد زبان و ادب نے جتنی ترقی کی اس سے کہیں زیادہ فن تعمیرات کو فروغ ہوا اور جس سے عام طور پر شاہ جہانی حشمت و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ جہاں کو تعمیرات سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس کے زمانہ میں جو عمارتیں تیار ہوئیں وہ انجینیرنگ کے اعلیٰ کمالات کے زندہ جاوید نمونے ہیں اور آج ان کو بنے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا لیکن ان کی دلاویزی اور تازگی میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا ہے اور ان سے دنیا کے سیاحوں کے ذہن و نظر کی ضیافت اب بھی ہوتی رہتی ہے ان میں رفعت، سکون اور شوکت پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ماہرین فن کو ان میں کوئی نقص نظر آتا ہو لیکن عام طور سے جو کوئی ان کو دیکھتا ہے مسحور اور مبہوت ہو جاتا ہے، شاہ جہانی عہد کے تمام تاریخی لٹریچر ضائع ہو جائیں اور صرف اس زمانہ کی عمارتیں باقی رہ جائیں تو ان ہی کو دیکھ کر اس دور کو انتہائی پر شوکت کہنے میں ذرا بھی شبہ نہ ہوگا ان عمارتوں کا جو اسٹائل ہے اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کلچر نے دوسرے کلچر کو کس طرح متاثر کیا اور ان کو خاطر خواہ سرپرستی میں ایسا فروغ ہوا کہ وہ منتہائے کمال کو پہنچ گئے، شاہ جہاں کو فن تعمیر کا فطری ذوق تھا اس کو اس سائنس میں پوری دسترس حاصل تھی جب عمارت کا کوئی نقشہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ ماہرین فن کو طلب کر کے پہلے مشورہ کرتا اس کے حسن و قبح پر گفتگو کر لیتا تو اپنی منظوری دیتا اس کی خود بینی اور اعلیٰ حوصلگی ہمیشہ اس کو اس بات پر آمادہ رکھتی کہ جو چیز ہو وہ اپنی جگہ پر مکمل اور نہایت ہی اعلیٰ ہو اسی خود بینی نے تعمیرات میں بھی نیا اسٹائل پیدا کر دیا اس کو نئی نئی عمارتیں بنانے کا ایسا ذوق تھا

کہ جہاں گیا عمارتیں بنوائیں پھر بھی اس کی پیاس نہ بجھی اجمیر، کشمیر، لاہور، انبالہ، باری، فیض آباد، گوالیار، کابل میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتیں بہت سی ہیں لیکن آگرہ اور دہلی میں اس کے اعلیٰ ذوق کی تکمیل ہوئی۔

آگرہ میں دیوان عام، دیوان خاص اور حرم کے محلات میں سنگ مرمر کے فرش پر نقاشی اور گل کاری کے اعلیٰ نمونے ہیں، شمن، برج، جواہرات سے آراستہ پیراستہ رہتا تھا یہیں شاہ جہاں کی وفات ہوئی، قلعہ کے اندر سب سے سادہ لیکن اپنی جگہ پر لا جواب عمارت موتی مسجد ہے یہ سات سال میں تین لاکھ روپے سے بنی اس میں سادگی اور آرٹ کی آمیزش کا انتہائی کمال موجود ہے، قلعہ سے باہر جہاں آرابیگم کی بنوائی ہوئی جامع مسجد ہے یہ پانچ سال اور پانچ لاکھ روپے میں تعمیر ہوئی یہ اپنے خاکہ، ساخت، تکمیل، ہمواری اور تناسب کے لحاظ سے فن تعمیر کا ایک بہت ہی عمدہ نمونہ ہے۔

لیکن آگرہ کی سب سے دلآویز اور خوبصورت چیز تاج ہے اور شاید دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، منوئل لکھتا ہے کہ یہ ایک مثالی تخیل کا نمونہ ہے اور اس مثالی تخیل کا تعلق عمارت سازی سے زیادہ سنگ تراشی سے ہے اس کی لطافت و نفاست، تعمیری شوکت، حسن ذوق اور کاریگری کی تعریف کرنی ممکن نہیں اس کے چمکتے ہوئے سنگ مرمر، پیاز نما گنبدوں، حسین جالی دار دیواروں اور مرصع کاریوں کا ذکر کوئی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ہے یہ ایک حسن ہے جس کو دیکھ کر مسرت کی لہریں ہمیشہ ہمیشہ اٹھتی رہیں گی، ہندوستان کی عمارت سازی کی تاریخ میں ایسی کوئی عمارت نہیں بنائی گئی جس میں ایسی شوکت ہو، ایسی سادگی ہو، ایسی ہمواری اور ایسا تناسب ہو اس کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دلوں میں فرحت محسوس ہوتی ہے۔

دہلی کا لال قلعہ بھی اپنے تناسب اور ہمواری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے یہ اپنے حسن اور شوکت کی بنا پر تو مشرقی ممالک میں لا جواب ہے اور شاید دنیا میں بھی ایسی

عمارت شاید ہی ہو اس کے بڑے پھانک سے اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع کمرہ ملتا ہے جس سے آگے چل کر ایک صحن ہے اس کے آگے نوبت خانہ ہے جس کے سامنے دیوان عام ہے یہ آگرہ کے دیوان عام سے زیادہ شاندار ہے پھر قلعہ کے شمال میں دیوان خاص ہے جو اپنی مرصع کاری کے لحاظ سے شاہ جہاں کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ مزین ہے ممکن ہے کہ تعمیرات کے ماہرین اس کے اسٹائل میں نقص نکالیں لیکن بہ ظاہر یہ بہت ہی پر شکوہ ہے اس میں تاج کی سادگی نہیں لیکن یہ تو شاہ جہاں کی شوکت و حشمت کے منتہائے کمال کے مظاہرے کے لیے بنایا گیا تھا اور اس لحاظ سے یہ ایک مکمل نمونہ ہے، لال قلعہ کے سامنے بلندی پر جامع مسجد ہے جو آگرہ کی موتی مسجد سے مختلف ہے اس میں لال قلعہ ہی کی شوکت و حشمت نظر آتی ہے جو اس لیے مناسب ہے کہ محل کے سامنے بنائی گئی تھی اس میں سنگ سرخ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے کہ لال قلعہ میں بھی اسی رنگ کے پتھر لگے ہوئے ہیں:

مصوری: شاہ جہاں کو تعمیرات سے ایسا شغف رہا کہ اس نے مصوری کی طرف کم توجہ کی لیکن اس کی شاہانہ سرپرستی بدستور قائم رہی اس کے دربار کے مصوروں میں محمد فقیر اللہ خاں اور میر حاتم امتیازی حیثیت رکھتے تھے، آصف خاں اور شہزادہ دارا شکوہ بھی مصوری کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے، دارا شکوہ کے پاس مصوری کا جو لبم تھا اس سے اس کے آرٹ کی قدردانی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے لیکن اس عہد کی مصوری میں کوئی خاص بات پیدا نہ ہو سکی، جہانگیر کے دور میں اس کی جتنی ترقی ہوئی تھی اس سے زیادہ نہ ہو سکی بلکہ رنگ آمیزی اور مٹلا جردل کو ضرورت سے زیادہ تباہ دیا گیا کہ اس میں حسن کے بجائے قبح پیدا ہو گیا، خاکے کی تخیل آرائی میں بھی کوئی جدت طرازی نہیں کی گئی۔

خطاطی: دربار میں مصور اور خطاط کی قدردانی یکساں طور پر ہوتی تھی بعض مخطوطات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بڑی محنت و مشقت سے تیار کیا جاتا تھا، دربار کا سب سے ممتاز خطاط محمد مراد شیریں قلم تھا، میر امام کا شاگرد آقا راشد مدد حروف لکھنے میں ماہر تھا،

میر صالح اور محمد مومن بھی بڑے اچھے خطاط تھے، صالح فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا شاعر بھی تھا، مومن بھی فارسی میں اشعار کہا کرتا تھا، کفایت خاں اور جلال الدین یوسف مشہور شکتہ نویس تھے:

موسیقی: اکبری عہد میں تان سین نے جو موسیقی کو جو ترقی دی اس سے زیادہ ترقی تو نہ ہو سکی لیکن شاہ جہاں کو موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا وہ دھرپد کو خاص طور پر پسند کرتا تھا اور اس فن کا ماہر تان سین کا داماد لال خاں سمدر تھا، شاہ جہاں موسیقی کے ہندو ماہرین میں سے جگن ناتھ کو بہت محبوب رکھتا تھا اس کو مہا کوی رائے کا خطاب بھی دیا، شاہ جہاں کی شان میں مدیہ اشعار بھی کہا کرتا تھا جس کے صلہ میں اس کو انعامات ملا کرتے تھے اس عہد میں سکھ سین کو رباب اور سور سین کو بنیا بجانے میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔

طرز حکومت: شاہ جہاں کو پوری سلطنت کی اساس ایک مکمل نظام پر تھی اس کا اقتدار اعلیٰ ہر شعبہ پر قائم تھا بلکہ مذہبی حیثیت سے وہ ظل اللہ بھی سمجھا جاتا تھا اسی کا حکم آخری حکم سمجھا جاتا تھا بشرطیکہ وہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، نظری حیثیت سے اس کے اختیارات غیر محدود تھے لیکن عملی طور پر اس کے اختیارات پر پابندی بھی ہوتی تھی اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی فوج کے ذریعہ سے اپنی رعایا پر اپنے ہر حکم کو نافذ کر سکتا تھا لیکن ایسا کرنا ہر موقع اور ہر حال میں ممکن نہ ہوتا تھا، بادشاہ وقت کو روایتی اور رسمی قوانین کا احترام کرنا ضروری تھا اور ازمنہ وسطیٰ میں ان قوانین کی حیثیت موجودہ دور کے مدون قوانین ہی کے برابر ہوا کرتی تھی اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں تحریری قوانین نہ تھے لیکن اس سے ہرگز یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ بادشاہ وقت جابرانہ حکومت کیا کرتا تھا بعض یورپین سیاحوں نے اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے لیکن اس معاملہ میں ان کی رائے زیادہ وقیح نہیں کیوں کہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مغلوں کی حکومت مستبدانہ اور ظالمانہ ہوتی تو اتنے دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، عوام بغاوت کر کے اس کو ختم کر دیتے، یورپین سیاح بعض جزوی واقعات کو سامنے رکھ کر عمومی نتیجے

پر پہنچ جایا کرتے تھے اور بعض اوقات وہ ایک معمولی سی شہادت پر ایسی بات قلم بند کر دیتے تھے جس کا تعلق محض ان کے ذہن کے اختراع سے ہوتا تھا اس میں حقیقت نہیں ہوتی تھی۔

مغل حکومت کے نظام کی تمام تفصیلات کاغذات میں درج ہوا کرتی تھیں اور ان ہی کے مطابق نظم و نسق قائم تھا، روایتی قوانین کی پابندی سے بڑی سے بڑی پیچیدگیاں دور ہو جاتی تھیں بلکہ ایک لحاظ سے رعایا خوش اور مطمئن رہی ہوگی کہ موجودہ دور کی طرح کسی کو مقدمہ باز بن کر وکلا کے بیچوں میں گرفتار ہو جانے کی مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہوگا بلکہ عدل و انصاف کے حصول میں اس کو دیر نہ لگتی ہوگی اور قاضی بھی قوانین کے پھندوں میں الجھنے کے بجائے اپنے اختیار تمیزی اور ذہانت کو استعمال کر کے جلد فیصلہ کر دیتا ہوگا۔

مغل بادشاہ مطلق العنان ضرور تھے لیکن ان کی مطلق العنانی پر رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال حاوی رہا اس کے علاوہ وہ اپنی حکمرانی کے سلسلہ میں (انگریزوں کی طرح) باہر سے حکم نہیں منگایا کرتے تھے اس لیے ان کی سلطنت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین میں مستحکم ہوتی رہی اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغلوں نے ایسی تمام صورتیں پیدا کر دی تھیں جن سے امن و امان کی زندگی ممکن ہو سکی اور اس لحاظ سے ان کی مطلق العنانی کو روشن خیال مطلق العنانی کہا جاسکتا چنانچہ ٹیوریز نے بھی لکھا ہے کہ شاہ جہاں لوگوں پر اس طرح حکومت نہیں کرتا جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا پر کرتا ہے بلکہ اس طرح جیسے ایک باپ اپنے خاندان پر کرتا ہے۔

اس کے پورے نظام حکومت میں ایک قوت اور زندگی محسوس ہوتی تھی، بلخ، قندھار اور دکن میں بڑی لڑائیاں لڑی گئیں لیکن سلطنت کے دوسرے حصوں میں امن اور استحکام بھی قائم رہا، منوکی نے شاہ جہاں کے عدل و انصاف کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، ٹیوریز کا بیان ہے کہ شاہراہوں پر ایسا امن قائم تھا کہ کبھی کسی کو چوری کی سزا نہیں دی گئی۔

ڈاکٹر بنارس پرشاد نے جس مورخانہ رواداری کے ساتھ شاہ جہاں کی حکومت پر عام

تبصرہ کیا ہے وہی رواداری دوسرے ہندو مورخین اور مغل بادشاہوں کی حکومتوں پر تبصرہ کرتے وقت اختیار کرتے تو آج ملک میں ہندو مسلمان کا ذہن تمام زہریلے اثرات سے پاک ہوتا، ڈاکٹر بنارس پرشاد کی طرح بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر پی۔ سرن نے اپنی کتاب ”مغلوں کی صوبائی حکومت“ لکھ کر اسی قسم کی رواداری کا ثبوت دیا ہے ان کی کتاب کا ایک باب قانون، عدل، پولس اور جیل ہے، اس میں مغل بادشاہوں کی عدل پسندی کو بڑا سراہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ عدل پروری اسی وقت ممکن ہے جب حکمرانی میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور طبقاتی رواداری ذہن پر چھائی ہو، اپنی عدل نوازی میں مغل بادشاہوں نے اسی رواداری کا ثبوت دیا جیسا کہ ڈاکٹر پی سرن کی حسب ذیل تحریروں سے ثابت ہوگا وہ لکھتے ہیں:

مغل بادشاہ منصفانہ فیصلہ کرنے میں بہت سخت تھے مگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا بادشاہ کا رشتہ دار بھی ہوتا تو بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کیا جاتا تھا، غلط قسم کے وقار اور رعب کو انصاف کرنے میں حائل ہونے نہیں دیا جاتا ہر حالت میں حکومت کی نیک نامی کا لحاظ ہوتا، مغل حکمران عوام کا اعتماد حاصل کر کے اپنا وقار قائم کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے وہ بیچارے بٹھانے کے قائل نہ تھے ان کو جب کبھی کسی حاکم کے ظلم اور غیر منصفانہ رویہ کی خبر ملتی تو اس کو سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہ کرتے، تمام مغل بادشاہوں کا یہی طریقہ رہا، پادری مونسریٹ نے عہد اکبری کے حال میں لکھا ہے کہ جب کوئی حاکم غلطی یا بری مثال پیش کرتا تو بادشاہ اس سے پورا مواخذہ کرتا جن باتوں سے عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ان کے انسداد میں بادشاہ کوئی رورعایت نہ کرتا..... بادشاہ کو انصاف اور عوام کے حقوق کا بڑا لحاظ تھا اگرچہ جہانگیر اور شاہ جہاں نے حکومت کے نظم و نسق میں اکبر جیسی مستعدی ظاہر نہیں کی لیکن عدل پروری میں کسی قسم کی کمی نہیں کی اس میں شک نہیں کہ اچھی سے اچھی حکومتوں میں بے انصافی اور بد معاہدگی کی مثالیں پائی جاتی ہیں کوئی حکومت برائیوں کا پورا استیصال نہیں کر سکتی لیکن مغلوں کے عہد میں جب نظم و نسق میں کچھ بھی انتشار پیدا ہو جاتا تو اس وقت

بھی عوام کے مفاد کی پوری نگہداشت کی جاتی اس کی شہادت ملکی اور غیر ملکی اہل قلم کی تحریروں سے ملتی ہے.... اکبر کے زمانہ میں ایک فرنگی سیاح مزریق اڑیسہ میں جالیسر سے نزاین گڑھ جا رہا تھا ایک گاؤں میں اس کے دو ساتھیوں نے دو مور مار ڈالے مزریق کے تمام ساتھی گرفتار کر لیے گئے اور جب مجرم شقہ دار کے پاس پیش کیا گیا تو شقہ دار نے پوچھا کہ ہندوؤں کے گاؤں میں جاندار چیز کے مار ڈالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ شقہ دار مسلمان تھا اس لیے فریق نے یہ کہہ کر متاثر کرنا چاہا کہ اسلام میں جانوروں کو مارنے کی ممانعت نہیں ہے، شقہ دار نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے لیکن ہمارے بادشاہ نے جب اس علاقہ کو فتح کیا تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اور اس کے جانشین یہاں کے لوگوں کو ان کے قوانین اور مراسم کے مطابق زندگی بسر کرنے دیں گے اس لیے منو کسی قسم کی وعدہ شکنی برداشت نہیں کر سکتا، شقہ دار نے مزریق سے سزا کو ہلکا کر دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ مدعی بھی راضی ہو جائے کیوں کہ وہ مدعی کو ناراض کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینے کی تھی، شقہ دار نے صرف انگلیاں کاٹ دینے کا حکم دیا لیکن مزریق نے اس کی عذر داری کی تو بالآخر مدعی کی خواہش پر مجرم کو اس کے سامنے کوڑے لگوا کر بری کر دیا گیا، اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ دارالسلطنت سے دور دراز مقامات میں بھی رائے عامہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا.... جہانگیر اور شاہ جہاں نے کبھی کبھی غیر روادارانہ پالیسی ضرور اختیار کی لیکن انھوں نے عوام کی روایات کا لحاظ برابر رکھا اور وہ ان کے مطالبات کے سامنے جھکتے بھی رہے.... گجرات کے ناظم ۵۲-۱۹۲۸ء حافظ محمد نصیر کو جس دوام کی سزا دی گئی کیوں کہ بعض تاجروں نے اس کے خلاف شکایتیں کیں جو تحقیقات کے بعد صحیح ثابت ہوئیں، ایسی مثالیں مغلوں کی حکومت میں کافی ملیں گی جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں رائے عامہ موثر تھی اور مغل بادشاہوں کو ظالم عہدہ دیداروں کے مقابلہ میں عوام کے مفاد کا پورا پورا خیال تھا... (دی پروٹیکشن گورنمنٹ آف دی مغلز، باب قانون، عدل، پولیس اور جیل)



**HINDUSTAN KE AHAD - E - MAAZI MEIN  
MUSALMAN HUKMARANON  
KI MAZHABI RAWADARI**

**Vol. II**

**SYED SABAHUDDIN ABDUR RAHMAN**

**Darul Musannefin Shibli Academy**

Azamgarh, U.P. 276001

Ph. 05462 - 265080, 265017

[www.shibliacademy.org](http://www.shibliacademy.org)

email.: [shibli\\_academy@rediffmail.com](mailto:shibli_academy@rediffmail.com)

ISBN 93-80104-37-5



**Price : 100.00**